جمیل ملک

پردۂ سخن

پردۂ سخن

(غزلیں)

۱۹۵۸ء ــــــ تا ــــــ ۱۹۷۴ء

○

جمیل ملکؔ

○

نوید پبلشرز این / ۲۲۲، پراچہ سٹریٹ
راولپنڈی

ناشر :۔ــــــــ نوید پبلشرز، این/۲۲۲، پراچہ سٹریٹ، راولپنڈی

طابع :۔ــــــــ جنگ پرنٹنگ پریس راولپنڈی

تعداد :۔ــــــــ ایک ہزار

کتابت :۔ــــــــ عبد الغنی

سرورق :۔ــــــــ بشیر موجد

طبع :۔ــــــــ اوّل

سن اشاعت :۔ــــــــ ۱۹۷۵ء

قیمت :۔ــــــــ پچاس روپے

عکاسی :۔ــــــــ عامر حسین

انتساب

○ —— بڑے بھائی عبدالعلیم کے نام

جنہوں نے ہمارے گھرانے میں علم کا چراغ روشن کیا

○

○ —— قاضی انجم رضوانی کے نام

جنہوں نے میری روح میں فن کا دیا جلایا

مصنف :- جمیل ملک

ولادت :- راولپنڈی، ۱۲ اگست ۱۹۲۸ء

تعلیم :- ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی)
بی ایڈ ـــــ جے. ڈی

پیشہ :- درس و تدریس (ایسوسی ایٹ پروفیسر / وائس پرنسپل سی بی سرسید کالج)

تصانیف

۱- سروچراغاں (غزل)

۲- طلوع فردا (نظم)

۳- ندیم کی شاعری (فکر و فن، شخصیت) تنقید

۴- پردۂ سخن (غزل)

زیر ترتیب

۱- نظمیں

۲- تنقیدی مضامین

۳- پنجابی شاعری

۴- پنجابی مضامین

کندن کی طرح جمیل ہوں میں
میں آگ سے بار بار گزرا

سخن سخن

'سروِ چراغاں' میں جمیل ملک کی شاعری ایک نوآموز الہڑ اور بے باک شاعر کے سفر کے رنگارنگ تجربات' مشاہدات' اور حسیات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ سروِ چراغاں میں جمیل ملک ایک حساس درد مند اور انسان دوست شاعر کے روپ میں ابھرتا ہے۔ سروِ چراغاں کا نفسیاتی مطالعہ جہاں ہمیں عمل' ردِ عمل اور ذات سے کائنات تک کے مختلف نشیب و فراز کے منظر دکھاتا ہے۔ وہاں یہ بات بھی مختلف اسباب کے ساتھ موجود ہے کہ سروِ چراغاں کے جمیل ملک کا فن اور احساس محض نفسیاتی موشگافیاں ہی نہیں بلکہ اس کے فکر و فن میں معاشرے کے تمام اسرار و رموز اور ان اسرار و رموز کے مختلف پہلو اپنے سیاق و سباق کے ساتھ غزل کے اشعار میں ڈھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

میرے نزدیک 'سروِ چراغاں' خیال اور اسلوب کے لحاظ سے نہ صرف ایک جدید تر شاعرانہ مجموعۂ کلام ہے۔ بلکہ ترقی پسند شاعری میں سروِ چراغاں کی حیثیت غزل کے ایک نمائندہ مجموعے کی سی ہے۔ سروِ چراغاں میں جمیل ملک نے سوزِ یقیں اور گرمیٔ انفاس سے پیدا ہونے والے جس بھرپور جذبے کا اظہار کیا ہے وہ جمیل ملک کے ہم عمر یا ہم عصر شعراء کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔ سروِ چراغاں کے مطالعے سے میرے اس دعویٰ کا ثبوت ملتا رہے گا۔ جس میں بے شمار ایسے زندہ شعر ہیں جن کی آب و تاب وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔

'سروِ چراغاں' کے بعد 'پردۂ سخن' ، غزل میں جمیل ملک کے سفر کے دوسرے مرحلے کی داستان ہے ایک ایسے مسافر کے سفر کی داستان جو مسافت پر مسافت طے کرتا چلا جا رہا ہے، مگر اسکے ہاں تھک ہار کر بیٹھ جانے کا انداز کہیں نہیں ملتا بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ سفر کی صعوبت' راہ کے پیچ و خم اور دشوار گذار مرحلوں سے مسافر اور زیادہ تازہ دم ہوتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ تازگی جو سروِ چراغاں کی جان

تھی، پردۂ سخن میں جمیل ملک کی غزل کی روح بن کر ابھرتی ہے۔ اس تازگی میں اب ایک مشاق فن کار کی چابکدستی اور ایک ذہین صناع کی صناعی کے دلکش نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں۔

جمیل ملک کے دوسرے مجموعۂ غزل 'پردۂ سخن' کو زیر بحث لانے سے پہلے اس دور کے پردۂ سخن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پچھلے دس پندرہ سال کی غزل کا ایک سرسری سا جائزہ لیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں غزل بالعموم اپنے سفر کی ایک منزل طے کرنے کے بعد ایک ایسے نقطے پر پہنچ گئی ہے جہاں سے اس کی مراجعت کا آغاز ہو گیا ہے اور مراجعت کے اس سفر میں غزل کے وہ تمام ترقی پسند اور جدید رجحانات دب کر رہ گئے ہیں جو اپنی ارتقائی شکل میں منزل کے آئینہ دار رہے تھے۔ غزل کی مراجعت کا یہ سفر اب بھی جاری ہے اور حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ غزل کو ترقی پسندی اور جدت کا علمبردار کہنے والے اس بات پر مصر ہیں کہ داغ دہلوی کے عشق و عاشقی کے مضامین ہی دراصل غزل کی جان ہیں —— یہ اصرار شکست فن کی منزل ہی نہیں بلکہ غزل ہی کی زبان میں شکست فن کا اقرار بھی ہے۔ میری یہ بات درست ہے یا نہیں۔ یہ وقت ثابت کرے گا۔ میں طبعاً یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ غزل آج ایک موڑ پر رک گئی ہے یا غزل گو شعراء اس موڑ کو ہی منزل کا نام دے رہے ہیں گو یہ موڑ غزل کی منزل نہیں۔ پردۂ سخن سے ہی میں اپنے دعوے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہتا ہوں کہ سخن ایک ایسا پردہ ہے جس پر اظہار کی مختلف تصاویر اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ گزرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ وہ پردہ نہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے

کیسا پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں'
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

مگر یہ پردۂ سخن تو جمیل ملک کا پردۂ سخن ہے۔ جس کے ہر منظر میں جیتے جاگتے معاشرے کی زندہ اور متحرک تصویریں سامنے بھی آتی ہیں رو برو گفتگو بھی کرتی ہیں اور اظہار کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ابلاغ کی منزلیں بھی طے کرتی ہیں۔

تیری جستجو میں نکلے تو عجب سراب دیکھے
کبھی شب کو دن کہا ہے کبھی دن میں خواب دیکھے

مرے دل میں اس طرح ہے تری آرزو خراماں
کوئی نازنیں ہو جیسے جو کھلی کتاب دیکھے

جسے میری آرزو ہو جو خراب کو بکو نہ دو
مجھے دیکھنے سے پہلے تجھے بے نقاب دیکھے

یہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ تنگنائے غزل نے جب کسی بحر بیکراں کی طرف سفر کو خیر باد کہہ کر واپسی کا سفر شروع کیا تو اس تنگنا میں ایک ایسی لہر بھی تھی جس نے منفی ردعمل کو قبول نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ منفی ردعمل کے نتیجے میں غزل کے مثبت عمل اور ردعمل کا سلسلہ اور شدت سے نمایاں ہوا ہے اور تمام ملک اس تمام کشمکش میں مثبت انداز میں غزل سرا رہا ہے۔

منہ بند حسرتوں کو سخن آشنا کرو
توڑو سکوتِ سازِ غزل ابتدا کرو
لاؤ کہیں سے سنگِ ملامت ہی کیوں نہ ہو
یا رو شکستِ شیشۂ دل کی دعا کرو

آج ادب جس نہج پر چل رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل محض ایک محبوبہ کی سوقیانہ حرکات کا دوسرا نام ہے جو محض ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے اور جسکا انتظار انتظار برائے انتظار ہے جس کے رمز وکنایہ میں نمائش ہی نمائش جلوہ گر ہے۔ اس طرح ایک بار پھر اس دقیانوسی نظریے کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہمارے انحطاط پذیر ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے معاشرے سے فن کار کا کوئی تعلق نہیں اور زندگی سے متعلق تمام صحت مند قدروں سے شاعر اور ادیب کا بس اتنا ہی واسطہ ہے کہ وہ اپنے تمام تر احساسات کو سرنگیت کی آرائشوں کے ساتھ غزل کی زبان میں ڈھال دے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جو بے اصولی کے مترادف ہے۔ آپ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ماضی میں بیشتر یوں ہوا ہے کہ انسان نے اپنی بقا کے لئے جو مثبت اصول یا قدریں تخلیق کے میدان میں وضع کیں اور جن فنکاروں نے ایسا کرتے وقت بے جان اور بے روح اصولوں اور قدروں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا وہ راندۂ درگاہ قرار دیئے گئے اور شاید غالب کو اسی لئے کہنا پڑا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

جمیل ملک اسی راندۂ درگاہ قبیلے کا ایک ایسا فرد ہے جو یہ جانتا ہے کہ یہ ادبی درگاہیں خودساختہ درگاہیں ہیں' ان کی حیثیت نہ زمینی رشتوں کی آئینہ دار ہے نہ آسمانی رشتوں کی پیامبر، کچھ بت پرستوں نے اپنے جذبۂ بت پرستی کی تسکین کے لئے یہ ادبی درگاہیں تعمیر کر رکھی ہیں اور خود ہی بت، بت پرست اور مجاور بنے اپنے مریدوں میں تعویذ پر تعویذ تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔ جمیل ملک نے نے اس تمام بت پرستی کو نہ تو تسلیم کیا اور نہ ہی کسی آذر کے صنم خانے کا کوئی بت بننے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے اپنا فن کسی ادبی درگاہ یا ادب کے کسی پیر تسمہ پا کی نذر نہیں کیا۔ اس لئے کہ جمیل ملک کا فن مٹی سے جنم لیتا ہے اور مٹی بھی وہ جو پھولوں کو جنم دیتی ہے اور اگر اس مٹی سے کسی پھول کی جگہ کوئی انگارہ جنم لیتا ہے تو وہ فوراً پکار اٹھتا ہے

اس چمن میں نہ کہیں پھول نہ شبنم نہ صبا
دل ہے ویراں نگہہ ناز یہاں کچھ بھی نہیں
تم بھی کہتے ہو کہ آباد ہے دنیا میری
میرے مونس مرے ہمراز یہاں کچھ بھی نہیں
کس سے کہیئے کہ سنائے کوئی پرسوز غزل
نہ مغنی نہ کوئی ساز یہاں کچھ بھی نہیں'

یہ اشعار غزل کی دالپسی کے سفر میں اُس مثبت انداز کے غماز ہیں جس نے شکست فن کی منزل کو شکست فن کی منزل ہی کہا ہے اور ایک خلا کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسی آویزش کی تصویر پیش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار زندگی سے پیار ہی نہیں کرتا' بلکہ وہ عروس فن کی آرائش کے لئے اپنا خونِ جگر تک پیش کر دیتا ہے ۔ جمیل ملک کی غزل میں جگہ جگہ یہ فریاد ملے گی جس کا مطلب محض یہ ہے کہ فن کار اگر اپنے فرائض اور حقوق کی بازیابی کے لئے ایک لمحے کے لئے بھی کوتاہی کریگا تو اس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اسی احساس کے تحت جمیل ملک اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے غزل کی زبان میں نہ صرف ماحول کا تجزیہ ہی کرتا ہے۔ بلکہ اس کے احساسات و تاثرات غزل کے طبعی ارتقا کے رواں دواں سفر میں اپنی پوری شدت کے ساتھ رہنمائی کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

غم جاناں غم دوراں کو یک جا کر دیا ہم نے
خدائے زیست حیراں ہے کہ یہ کیا کر دیا ہم نے
چھبن کانٹے میں رکھ دی پھول سے گلشن کو مہکایا
متاع درد میں بھی حسن پیدا کر دیا ہم نے
مہ و خورشید آئینے ہیں اپنے دیدہ و دل کے
ہم آئے تو اندھیرے میں اجالا کر دیا ہم نے

آج غالب و داغ بیک وقت زندہ ہوتے تو بلاشبہ داغ کو غالب سے بڑا شاعر قرار دیا جاتا ۔ یہ ادب کی روایت رہی ہے کہ ہر زمانے میں اپنے دور کے غالب مغلوب اور مغلوب غالب رہے ہیں آج کی غزل کی شاعری محض چمک دمک کا نام ہے۔ جمیل ملک کا مجموعہ "پردۂ سخن" شاید قارئین کے ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھنے کے جذبے کی تسکین کرے یا نہ کرے یہ بات ایک حقیقت بن کر سامنے آ چکی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہوتی چلی جائے گی کہ جمیل ملک کی غزل کا ایک الگ اور منفرد انداز ہے۔ زبان سے یہ اقرار کر لینے کے باوجود کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اس دور کے ترقی پسندوں نے بھی قول و فعل کے تضاد کو اپنا شعار بنا لیا ہے جنہیں یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ ایک ترقی پسند کے لئے محض انسانی ہمدردی کے جذبے کا طرف دار ہونا ہی کافی ہے اور معاشرے کی اصلاح یا ترقی پسند قدروں کے فروغ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قول و فعل میں ایک ایسی ہم آہنگی بھی پیدا کی جائے جس کا معاشرہ تقاضا کرتا ہے ۔ پھر یہ فنکار فن کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا اصول درست تسلیم تو کرتے ہیں مگر میرے یہ ترقی پسند دوست اپنی اصلاح کے سلسلے میں وہی اصول قائم کرنے کے لئے تیار نہیں جس کی تبلیغ وہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک مثال یہ دی جاتی ہے کہ پکاسو کے کسی فن پارے کی توصیف بھی ایک ترقی پسند عمل ہے یہ ضروری نہیں کہ اب پکاسو کی طرح شاہکار بھی تخلیق کئے جائیں ۔ یہ ایک ناظر یا ادب کے قاری کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے لیکن وہ لوگ اگر یہ بات کریں جو ادب کی ترقی پسند تحریک اور قدروں کے اجارہ دار بنتے ہیں (یا اپنے آپ کو اس قسم کا اجارہ دار ثابت کرتے رہے ہیں) تو اس نقطۂ نظر کو یکسر رد کیا جا سکتا ہے۔ جب قافلہ سالاروں کا یہ حال ہو تو ادب کا ایک عام قاری بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ لورسا (لورکا) جیسا عظیم فنکار اپنے فن کے دریچوں سے زندگی کی تمام رعنائیوں کی منظر کشی کرنے کے باوجود کسی جرم کے بغیر قتل

کیوں کر دیا جاتا ہے ۔ ناظم حکمت کی ساری زندگی جیل میں کیوں گذر جاتی ہے؟ بلو نرودا صدر یک ... لب سے کیوں جاں بحق ہو جاتا ہے؟ بورس پاسترنک دو برس کے اندر اندر ہی راہی ملک عدم کیوں ہو جاتا ہے؟ مجھ جیسے ادب کے عام قاری کے لئے ایسے کئی پریشان کن سوال پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن جب کسی سچے فن کار کے فن کی ایک سچی جھلک سامنے آتی ہے تو یہ لاینحل عقدے یکے بعد دیگرے حل ہوتے چلے جاتے ہیں ۔

جمیل ملک کا فن بھی کسی حد تک ان سوالات کے حل کے لئے ایک انتہائی دلکش انداز میں اس یقین کا اظہار کرتا ہے جو جذبے کے خلوص اظہار کی سچائی اور فن سے لگن کی بنا پر ہی پیدا ہوتا ہے ایک عام انسان کی طرح ہر فنکار کے بھی دو رُوپ ہیں جسم اور روح ۔ جسم جو فنا ہو جاتا ہے ۔ روح جو کبھی فنا نہیں ہوتی ۔ ایک سچا فنکار جسم جسم فنا ہوتے ہوئے بھی اپنے پیغام کی صورت میں عصر عصر میں زندہ و پائندہ رہتا ہے ۔ اسے آشوب آگہی اور شعور کی صلیب بھی کہا جاتا ہے ۔ جمیل ملک اور اس کا فن اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت راستے کے ان دشوار گذار مرحلوں سے مسلسل آشنا ہو کر آگے بڑھتا رہتا ہے وہ آشوب آگہی میں نوحہ کناں نہیں نغمہ سرا ہوتا ہے ۔ شعور کی صلیب کو وہ ایک بوجھ محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس بوجھ تلے دب کر آہ و بکا کرتا ہے بلکہ اس کے اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک فنکار کے جسم کو قتل کیا جا سکتا ہے اس کے جذبے کو قتل کرنے کی جسارت نہ آج تک کسی ظالم کو ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو گی ۔ قاتلوں کی غلط فہمیاں ہی ظلم کے انتہائی سنگین دور میں بھی فکر و فن کے ایسے نازک ترین جذبات کو جنم دیتی ہیں جو مستقبل کی تابناک تصویریں بن جاتے ہیں ۔

زندگی کی داستاں حسن بیاں تک آ گئی
تیری افشاں سے چلی تھی کہکشاں تک آ گئی

فاصلے باقی نہ اب دریا و صحرا میں رہے
موج طوفاں یوں اٹھی ریگ رواں تک آ گئی

"سرو چراغاں" کی غزل ہو یا "پردۂ سخن" کی غزل ، جمیل ملک اپنی ذات اور عدم ذات کے حوالے سے سخن و فن کی آبیاری کرتا چلا جاتا ہے ۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ پردۂ سخن کے بارے میں اپنے خلوص کا اظہار کرتے ہوئے میرے علم میں یہ بات ہے کہ جمیل ملک کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ۔

کردار میں ایک مکمل یکسانیت اور عقائد میں حرف آخر تک پختگی اُن کے فن کو بڑے منظم طریقے سے زمرف استوار کرتی چلی گئی ہے بلکہ یہ بات بڑے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اُس کے شعری اثاثے میں ہر لحظہ کسی کمی کی بجائے اضافہ ہوتا چلا گیا ہے دوسرے لفظوں میں اُس کا بات کرنے کا انداز خالص اپنا ہے اُس کی آواز اپنی ہے ساز اپنا ہے اور فن کی یہ معراج بڑے حیلوں اور وسیلوں تک رسائی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ جذبۂ رسائی بھی اور احساسِ نارسائی بھی ہے۔ یہ اس دور کے ہر فنکار کا مرض اس لئے مقدر کردی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک مثبت اندازِ فکر کا حامل کیوں ہے؟

اک نہ اک یاد سے رہتا ہے یہ قریہ روشن
دل کی وادی کو کبھی خانۂ ویراں نہ کہو
دوستو عشق کی تفسیر نہ ہو پائے گی
غم جاناں کو بھی جب تک غم دوراں نہ کہو

یہی وہ جہت ہے، جسے غزل کی ترقی پسند جہت کہا جاتا ہے اور فیض اس جہت کے پیش رو ہیں۔ بہت کم ترقی پسند شاعر ایسے ہیں جنہوں نے پچھلے ۲۵ سال کے دوران اس جہت کو ایک تسلسل کیساتھ زندہ رکھا ہے۔ مگر جمیل ملک کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس نے اس جہت کو ایک بڑے معتدل خوشگوار اور مثبت انداز میں اپنے فن کے پس منظر میں جاری وساری رکھا اور اسی جہت سے اس نے اپنے دور کے نئے اور پرانے شاعروں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل کرلیا ہے اس کے حصول کے لئے اُسے زندگی کے بے شمار لق و دق صحراؤں اور سرابوں سے گذرنا پڑا ہے مگر ہر بار اس نے ایک حیات آفریں تبسم کے ساتھ اپنے فن کا سفر جاری رکھا بلکہ غم جاناں اور غم دوراں کے مختلف نازک مقامات سے بھی وہ بڑی خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

کسی فنکار کے لئے فکر و فن کا چراغ مسلسل روشن رکھنا ایک امتیاز ہی نہیں اعجاز ذات بھی ہے اعجاز ذات کے لئے جسم و جان جس طرح ریزہ ریزہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی کرسکتا ہے جو کبھی تخلیق کے کرب سے ہمکنار رہ چکا ہوتا ہے جمیل ملک نے اپنے فن کی بقا، سالمیت اور ایک مخصوص انداز اپناتے وقت کبھی یہ کوشش نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اپنے سامع یا قاری کو اپنے آپ سے کم تر سمجھتا ہے، حالانکہ ہمارا آج کا فن کار نفسیاتی طور پر اس ردعمل کا شکار ہے کہ قاری یا

سامع کو کیا ضرورت ہے کہ وہ فن کی تہ در تہ پھیلی ہوئی باریکیوں کے لئے ایک دیدۂ بینا پیدا کرے کیونکہ
اس مکتب فن کے نزدیک ایک عام قاری یا ایک عام سامع کے لئے شاعری محض ایک مترنم تاثر ہے
یہ تاثر چاہے عمومی جذبات کے ذریعے قائم کیا جائے چاہے اسے سُرسنگیت کے سہارے
دلوں میں اتار دیا جائے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ تاثرات کے کسی گذراں لمحے میں ایک لذت بخش سُرر
کا حامل ہو اور بس !!

قصۂ قدیم و جدید بے شمار وضاحتوں کا طالب ہے اس سے قطع نظر مجموعی طور پر یہ بات کہی
جاسکتی ہے کہ غزل کی جس قدیم روایت سے بیشتر ترقی پسند اور جدید غزل گو شعرائنے اپنا دامن
چھڑانا چاہا ، وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اگر تمام آویزش میں غزل کے چند ترقی پسند اور جدید شعرا کے
بزعم خود ترقی پسند اور جدید نظریات کا ایک سرسری سا ذکر کیا جائے تو غزل کے میدان میں یہ چند
نام نہاد نمائندہ شعرا عجیب و غریب قلابازیاں کھاتے ہوئے دکھائی دیں گے ۔ ایک جدید دیوانے نے غزل
کو بوتل کہا اور پھر بوتل کو صرف 'تل' کہنے پر اصرار کیا ۔ ایک اور نے شراب کو صرف 'راب' کہنے پر اکتفا کی اور
پھر یہ "لقوہ زدہ فالج معاب" دیوانے بظاہر دیوانے مگر بباطن ہشیار اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہیں
کہ آنے والا دور ان کے فن کے مزار پر نت نئے چراغ روشن کرے گا ۔

تخلیقی لگن آغاز سے انجام تک ہر سچے فنکار کے فن کی بنیاد بنتی ہے ۔ یہ لگن سچی ہو تو فن کے تمام
نرنا ہموار راستوں کے باوجود تخلیقی جوہر آشکار ہو کر رہتا ہے ۔ عمر بھر کے رطب و یابس کو تخلیقی جوہر کا
نام نہیں دیا جاسکتا ۔ یہ بات اس لئے کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ ابتدائے آفرینش سے شعبدہ گروں نے
زندگی کی تمام تر حقیقتوں کی نقاب کشائی کے باوجود کوشش یہ کی ہے کہ نسل در نسل زندگی کو ایک شعبدہ
سمجھا جائے ۔ جب کسی عیسیٰ ، کسی سقراط ، کسی امام حسین اور کسی منصور نے ان شعبدہ گروں کے مکر و فریب
کے پردوں کو چاک چاک کیا ہے تو کسی کے لئے پھانسی کا پھندا ، کسی کے لئے زہر کا پیالہ ، کسی کے لئے جامِ
شہادت اور ایک بار پھر کسی کے لئے آزمائش دار و رسن مقدر کر دی گئی ۔ اس کے باوجود سچ بولنے
والے سچ بولتے رہے ۔

شعبدہ گر اپنی شعبدہ گری سے اجالے کو اندھیرا اور اندھیرے کو مقدر کی سیاہی ثابت کرنے کی ناکام
کوشش کرتے رہے ۔ لمحوں کے اس ارتقا میں اجالے اندھیروں میں اور اندھیرے اجالوں میں ڈوبتے

رہے۔ یہ عمل، کل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔

جمیل ملک نے فن کو ہمیشہ اجالوں کا طرف دار سمجھا ہے اور یہ اتفاق یا حسن اتفاق نہیں بلکہ اس کے لئے اُسے ایک مسلسل اور منضبط جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ "پردۂ سخن" پر ابھرنے والے فن کے نقوش اس امر کی دلیل ہیں کہ اندھیروں اور اجالوں کی تمام کشمکش میں جمیل ملک کے احساسات و تاثرات اندھیروں کے چنگل سے رہائی پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں درست کہ یہ نقوش کبھی دھندلا بھی جاتے ہیں مگر یہ بھی درست ہے کہ دھندلے نقوش اکثر گہرے اور واضح بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ قاری پر یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جمیل ملک ترقی پسند نظریات کا حامل شاعر ہی نہیں بلکہ اس کا شعور پختہ فکر گہری اور اظہار مکمل اور بھرپور ہے۔ اس نے اپنی شاعری کا آغاز اس شعر سے کیا تھا۔

منزلِ ہستی کسی صورت سے طے ہو جائے گی،
زندگی کے موڑ تیرے گیسوؤں کے خم نہیں

آج بھی اس کا شعور ذات اور کائنات کی گتھیاں سلجھانے کے لئے فرہاد کے تیشے کی طرح اپنا کام کر رہا ہے۔ وہ کبھی فن اور زندگی کے ناطے سے غم جاناں تک پہنچتا ہے اور کبھی غم جاناں سے غم دوراں تک۔ آغاز سے انجام تک ایک آویزش سے دوچار رہتا ہے۔ اور اپنے اظہار کے ہر موڑ پر اپنے احساسات و تاثرات کا جائزہ بھی لیتا جاتا ہے۔

بزعم خود اسے ہرچند سلجھاتے رہے برسوں
مگر پھر بھی ابھی تک زلفِ ہستی میں وہی خم ہے

اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود ادب کے مختلف گروہوں کے نمائندہ ادیب اور شعرا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ادب محض شہرت اور اکتساب زر کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل سماجی عمل ہے، فرد بعض اوقات اس سماجی عمل میں سماج سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور بعض اوقات وہ سماج کی تمام تر پابندیوں رکاوٹوں اور فرسودہ روایات کے باوجود اپنے عمل کو جاری رکھتا ہے تا آنکہ سماج اس کے پیغام اور فکر و عمل سے پوری شدت کے ساتھ اثر قبول نہیں کر لیتا۔ اس سارے سماجی عمل کے مثبت اور منفی پہلو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ وہ لوگ جو اسے سماجی عمل ماننے کے لئے تیار نہیں وہ بلاشبہ ادب اور زندگی کی منفی قدروں سے تعلق رکھتے ہیں اور جو ذمہ دار افراد اسے ایک سماجی عمل قرار دیتے ہیں

دو کا حقہ مثبت پہلو سے آگاہی رکھتے ہیں۔ جمیل ملک بھی اس شعوری اور سماجی عمل کا علمبردار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اور اس کے فن کو ایک سماجی عمل کی صورت میں ہی نہیں، ایک مسلسل عمل کی صورت میں اپنا ادبی اور شعری سفر جاری رکھنا پڑا ہے اور آج بھی وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا یہ مقدس جذبہ اس کے فن کو صیقل کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی فن سے لگن بے پناہ خلوص اور کام کی دھن کے پیش نظر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنے فن کو ایک شاندار اور بڑے کارنامے میں بدل کر رکھ دے گا۔ اس کے تازہ مجموعۂ کلام میں بے شمار اشعار اس کی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں.

جب چھیڑ دی کسی نے تری دلبری کی بات
یوں کھو گئے کہ ہم بھی تری داستاں ہوئے
جو بڑھ گئے لپٹ کے ملیں اُن سے منزلیں
جو رہ گئے وہ گردِ پسِ کارواں ہوئے
ڈھالے ہیں ہم نے چاند اجالے ہیں دو جہاں
یہ معجزے جمیل بتاؤ کہاں ہوئے!!

عمل اور رد عمل کے جس ارتقائی سفر کا آغاز جمیل ملک نے ایک لٹے پٹے غم، ایک بے نام سی لذتِ درد اور ایک بے وجہ خلوص سے کیا تھا۔ اس سفر کو قریہ بہ قریہ اُس نے اپنے مکمل شعور سے ایک واضح اظہار اور ایک دردِ مشترک میں ڈھال دیا۔ یہاں تک کہ "پردۂ سخن" کی غزلوں میں وہ ایک مکمل قادر الکلام شاعر کے روپ میں ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لفظوں کے صوت و آہنگ کو وہ بھرپور شعریت اور خوشگوار تاثرات کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کا اظہار کہیں تکلف کا شکار نہیں ہوتا۔ جمیل ملک میرے اس احساس کی ترجمانی یوں کرتا ہے:

آئینہ خانوں میں کیا رکھا ہے حیرت کے سوا
کوچہ و بازار میں خونِ مسیحا دیکھتے
موت کو بھی ہم بنا لیتے متاعِ زندگی
قتل یوں ہوتے کہ سب دانا و بینا دیکھتے
میں تمہارے حسن کا بے ساختہ اظہار ہوں
اپنے آئینے میں میرا بھی سراپا دیکھتے

کیا یہ کم ہے فرش سے تا عرش ہو آنے تمیل
چار دن کی زندگی میں اور کیا کیا دیکھتے

اس قادر الکلامی کا حصول بڑے جان جوکھوں کا کام ہے کہ بہ ظاہر اس سعیٔ لاحاصل سے بہ ایں ہمہ ایک سچا فنکار سب کچھ حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ زمانے کی پرواہ کئے بغیر وہ ایک لگن اور ایک عزم کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے بستائش کی تمنا اور صلے کی پرواکو اپنی منزل تو کیا اپنے فن کے راستے کا کوئی سنگ میل بھی نہیں سمجھتا۔ ایک سچا فنکار زندگی کے جبر کو ایک زخم آمیز تبسم کے ساتھ پیش کرنے کے بعد یہ عہد بھی کرتا ہے کہ یہ زخم آمیز تبسم بھی زخم کے بغیر ہی نگارِ فن کے لب و رخسار کی آرائش کا باعث ہوگا۔

پیکر تراشی، نغمہ سرائی اور رنگ آمیزی جہاں سچے فنکار سے خونِ جگر کا تقاضا کرتی ہے وہاں فنونِ لطیفہ کے اجارہ داروں نے ہمیشہ یہ تاثر دیا ہے کہ فنکار کو نہ تو مادی آسائش درکار ہے اور نہ ہی اسے اپنی روح و جسم کا کوئی ہوش ہوتا ہے، وہ تو اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے فنکار کو کوئی سروکار نہیں۔ اس منفی انداز کو صدیوں سے فنکار کا مقدر بنانے کا حیلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔ جب کسی باشعور اور سچے فنکار نے اس منفی اندازِ فکر کے خلاف بغاوت کی ہے تو اسے ڈھنڈورچی، نعرہ باز اور گروہ بند ہونے کا طعنہ دیا گیا ہے۔ چند مثالوں کو چھوڑ کر آج بین الاقوامی طور پر ایک بار پھر فن، فن کار اور انسانی رشتوں کے درمیان بڑے بڑے حصار کھڑے کرنے کی ناپاک اور گھناؤنی سازشیں جاری ہیں، جس نے نہ صرف ساری دنیا میں ادب کے مستقبل کو مخدوش بنا دیا ہے بلکہ انسان ادب کے ذریعے اپنے گم گشتہ حقوق کی بازیابی کے لئے جو بھرپور کوششیں کر رہا ہے اسے سعیٔ لاحاصل ثابت کرنے کے منصوبے بھی برابر جاری ہیں۔ اس کے باوجود ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سنگلاخ زمینوں، بے کراں خارزاروں اور محکومی کی بسیط تاریکی میں ڈوبے ہوئے، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں اور صحراؤں کے بھرپور عوامی ترجمان فن و ادب کے جیالے لازوال انسانی قدروں کی بقائے دوام اور سالمیت کے لئے سر توڑ جد و جہد کر رہے ہیں۔ جو ماضی اور حال کے نوحے لکھنے کی بجائے امید کی ایک ایک کرن سینے سے لگائے نہ صرف ایک پیہم جاری و ساری عمل کا ثبوت دے رہے ہیں بلکہ آگے

بڑھتے ہوئے وہ ایک بر اعظم سے دوسرے بر اعظم تک عوام کی امنگوں، خواہشات آرزوؤں اور تمناؤں کی ہم رابر ترجمانی بھی کر رہے ہیں اس مثبت انداز فکر کے پس منظر میں برسوں کی وہ ریاضت بھی کار فرما ہے جسے ہم اپنے ماضی کا صحت مند ورثہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مثبت انداز فکر کے شعلے ذات کے خول سے کائنات کے ماحول تک ایک الاؤ کی صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اندر اور باہر کی اس آگ سے عروس فن کو کوئی آنچ یا گزند پہنچائے بغیر نکال کرلے جانا انتہائی مشکل اور بے حد دشوار کام ہے اور شاید اس صبر آزما مرحلے کے پیش نظر ہی غالب یہ کہنے پر مجبور رہے۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جمیل ملک بھی ایک منضبط فلسفۂ حیات کے تحت فن کا چراغ روشن کئے ہوئے ہے۔ اس کے لئے وہ بڑے سے بڑے طوفانوں سے گزر چکا ہے۔ اس منضبط اور مثبت فلسفے کو اپنانے اور نبھانے کے لئے اس نے بے حد محنت کی ہے۔ بے حساب نرم و نازک جذبات کو نذر آتش کرنے کی بجائے انہیں خونِ جگر سے زندہ اور متحرک بنا دیا ہے۔ اس تمام پر آشوب دور میں جمیل ملک نے اپنے احساسات اور تجربات کو وقت کی دہکتی ہوئی بھٹی میں کندن بنانے کا عہد کیا اور اس کے لئے اسے جو مختلف موڑ کاٹنے پڑے ان کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔

چلتے چلتے راستے خود ہی جدا ہوتے گئے
مدتوں کے آشنا نا آشنا ہوتے گئے
تم ہماری بے وفائی کا گلہ کرتے رہے
ہم تمہاری کج ادائی پر فدا ہوتے گئے
اپنا ذوقِ بندگی تو عشق کی معراج ہے،
وہ خدا کیوں بن گئے کیوں نارسا ہوتے گئے

ایک مثبت انداز فکر اور ایک منضبط فلسفۂ حیات اپنانے کے لئے وہ ہر موڑ پر اپنے لئے ایک کے بعد دوسری حیثیت کا تعین کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ نئی جہت کے لئے جب اپنی کسی سابقہ جہت کو ترک کرتا ہے تو یہ احساس کبھی نہیں ہوتا کہ اس کی پرانی جہت اس کی نئی جہت سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی بلکہ پرانی سے نئی

جہت تک اس کے فن کے ارتقائی مراحل ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت اس کے موضوعات اور موضوعات کے اظہار میں جگہ جگہ موجود ہے۔ جس سے یہ گواہی بھی ملتی ہے کہ وہ عظمت فن کی بلندیوں کو چھونے کے لئے زینہ بہ زینہ اوپر اوپر جا رہا ہے۔ ترک جہت اور تعین جہت کی مثالیں وہ اپنے متذکرہ اشعار کے علاوہ ان اشعار میں بھی دے رہا ہے۔

اپنا خلوص ہو کہ تری بے رخی کی بات
دونوں سے بن سکی نہ غم زندگی کی بات
مہتاب و آفتاب جلے راکھ ہو گئے
بھولے سے ہم نے کی تھی یہاں روشنی کی بات
شاعر بھی نغمہ گر بھی مصور بھی ہے جمیل
سانچے میں ڈھل سکی نہ مگر اپنے جی کی بات

نظریات اور نظریات کا یہ سارا کھیل جمیل ملک کی ایک صحت مند اور شعوری کوشش ہے۔ اور ہر مسافت کے بعد اس کے اپنے نظریات بغیر کسی تردد کے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اس کے لئے اسے کتنے لوازمات کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ قاری کو وہ اس کا احساس بھی نہیں ہونے دیتا۔ یہ اس کا فن کارانہ خلوص ہے جو اس کے فن اور قاری کے درمیان کوئی دیوار نہیں بن پاتا۔

کتنے ہونٹوں پہ شگوفوں کا بسیرا ہوگا
جب بہار آئے گی جس وقت سویرا ہوگا
کوئی بھی داغ جہاں سینۂ گیتی میں نہیں
جانے وہ کتنی بہاروں کا بسیرا ہوگا،

فکر ایک مسلسل اور نامختتم تلاش کا دوسرا نام ہے۔ فکر ——— خدا ہے یا نہیں؟ ——— فرشتے آسمان پر خدا کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں؟ ——— اور انسان ——— زمین پر اپنے خودساختہ خداؤں کے سامنے سربہ زانو مجبور و مقہور کیوں ہے؟ ——— بہاریں زخم زخم کیوں گزر جاتی ہیں ——— ؟ اور خزاں کا بے رحم ہاتھ اپنے بھورے خاکستری رنگ بکھیر کر سینۂ گیتی ہی کو نہیں، انسانی جذبات کو بھی کیوں مسل مسل جاتا ہے؟ سورج کی کرن کرن

رہی اور روشنی ہو رہی ہے کیوں نہیں پہنچ سکتی [illegible] ایک ننھے منے چراغ کی کانپتی ہوئی زرد لو تاریک ماحول کو منور [illegible] کیوں بن جاتی ہے ؟ [illegible] یہی وہ فکرِ بے پایاں ہے جو کل کے باشعور اور آج کے حساس فنکار کی دولت ہے بڑا سرمایہ ہے جو اسے جان عزیز سے بھی زیادہ عزیز ہے اور ایسے فن کار جب کسی معاشرے میں جنم لیتے ہیں تو اس معاشرے کے مستقبل کی تابناکی ایک یقینی امر بن جاتی ہے فکر کے ایسے ہی چراغ پردۂ سخن کی سرزمین پر جا بجا روشن روشن دکھائی دیتے ہیں۔

ڈھونڈتے پھرتے ہیں زخموں کا مداوا نکلے
اس بھرے شہر میں کوئی تو مسیحا نکلے

اف یہ انبوہِ رواں ہائے مری تنہائی
کہیں رستہ نظر آئے کوئی تم سا نکلے

چاند سورج سے بھی تاریکیٔ دوراں نہ گئی
دیکھئے پردۂ تخلیق سے اب کیا نکلے

یہ کہہ دینا آسان ہے کہ فکر، فن اور ادبیت ایک دوسرے کے ساتھ گہرے رشتوں میں منسلک ہیں ہر چند یہ بات درست بھی ہے لیکن ایک زنجیر کے ان تین حلقوں میں ایک تسلسل اور ربط پیدا کرنا ایک دشوار ترین مرحلہ ہے اور اکثر یوں ہوا ہے کہ بہت سے اچھے فنکار اس نظم و ضبط میں یقین رکھنے کے باوجود اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکے کیا یہ قول و فعل کے تضاد کی بات ہے ؟ اس کے علاوہ بھی یہ ایک مسئلہ ہے جس پر بے شمار بحث کی جا چکی ہے بے شمار لکھا جا چکا ہے اور اس مسئلے کے حق اور مخالفت میں آج بھی اہل قلم اپنا پورا پورا زور صرف کر رہے ہیں، اس بحث کا نتیجہ تو وقت کے فیصلے کی صورت میں سامنے آئے گا مگر حقائق سے پہلو تہی، نتائج سے گریز اور حق کو حق تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں ملتا۔ ہر دور کی ادبی، ثقافتی، تمدنی، تہذیبی اور اس سے متعلق دوسری تحریکوں کے لئے یہ مسئلہ کل بھی موجود تھا اور آج بھی، یہ مسئلہ صحت مند روایات پر یقین رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے آزمائش اور امتحان سے کم نہیں۔ جو لوگ ادب برائے ادب کے نظریے کا فروغ چاہتے ہیں۔ وہ بھی اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں اس خلش کو محسوس کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اپنی ساخت اور پرداخت کی نفی کے خوف سے حق بات کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ مگر حقائق پر پردہ ڈالنے کے باوجود حق بات سامنے آ کر رہتی ہے۔ فن کار کا فن پتھر کو پتھر نہیں کہتا، فن کار کے ہاتھ میں فن کوہکن کے تیشے کی طرح ہے جو پتھروں سے میٹھے ٹھنڈے پانی کی نہر جاری کر دیتا ہے۔ پھر فن کار تو وہ ہے جو ایک

پتھر سے جیتا جاگتا متحرک جاندار بُت تراش لیتا ہے۔ بتھ ـــر ایک جامد و ساکن شے تخلیق کے جوہر سے آشنا ہو کر ابدیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ایک لائحہ عمل ہے اور اس لائحہ عمل میں ایک فن کار دوسرے سے اس صورت میں اختلاف تو کر سکتا ہے کہ ایک فنکار دوسرے سے منفرد رہے مگر فن کار اگر واقعی فن کار ہے تو اس خلاف کا سایہ اپنے فن پر نہیں پڑنے دیتا جب تک وقت یہ ثابت نہیں کر دیتا کہ صداقت پر مبنی نظریہ فن اختیار کرنے میں فکر و عمل کا کونسا راستہ درست ہے۔ فن کار جتنا عظیم ہوگا اتنا ہی اس کا فیصلہ (تمام عصری اختلافات کے با وجود) درست مناسب اور بر محل ہوگا۔ اس فن کار کا فیصلہ آنے والی نسلوں کو (درست ہونے کی صورت میں) راہ دکھا سکتا ہے اور غلط ہونے کی صورت میں گمراہ کر سکتا ہے۔ فن کار کا نظریہ فن اور اس نظریہ فن کا خلوص ہی آخر کار درست ثابت ہوتا ہے۔ ـــــ جمیل ملک بھی فن، نظریہ فن اور فن کارانہ خلوص کے تمام نشیب و فراز کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کئے ہوئے ہے کہ وہ صداقت کی تلاش میں کسی تعصب بے راہروی اور انتہا پسندی کو اپنے فن کی بنیاد نہیں بنائے گا بلکہ لائحہ عمل کے اختلاف کے باوجود لگن خلوص اور مشعل فکر کو ہی اپنا رہنما اصول تسلیم کرے گا۔ اُس کا نظریہ فن اپنا نظریہ فن ہے وہ باہر کی بات کو مشاہدے، تجربے اور مطالعے کے بعد قبول یا رد کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کا عہد ہے جسے وہ ہر حالت میں برقرار رکھتا ہے یہاں تک کہ اُسکے اندر کا فن کار اُس کے گرد و پیش پھیلے ہوئے ماحول سے مکمل آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے اُس کے فن میں ایک ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہو گیا ہے۔ اُس کی یہ اعتدال پسندی بعض ذہنوں میں اگر کوئی غلط تاثر پیدا کر دیتی ہے تو یہ ان ذہنوں کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اظہار کے اچھے یا بُرے ہونے کی تمام تر ذمہ داری فن کار پر عائد ہوتی ہے لہذا ایک فن کار خود ہی اپنے نظریہ فن کے غلط یا درست ہونے کا فیصلہ دے سکتا ہے۔ قاری کے فیصلے کی اہمیت مسلّم، مگر یہ بعد کی بات ہے ـــــ جمیل اپنی انفرادیت کو مختلف صورتوں میں برقرار رکھتا ہے۔ مثلاً جب وہ یہ کہتا ہے۔

زیرِ زمیں ملا نہ تہہِ آسماں ملا
ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ پیکر کہاں ملا
تم ڈھونڈنے چلے ہو کسے چاندرات میں
کب چاند کو بھی منزلِ شب کا نشاں ملا
مرنے کا مرحلہ ہو کہ جینے کی قید ہو
جو غم ملا جمیل غمِ جاوداں ملا

اور پھر ذات کے مکمل تشخص کے بعد اس کا اظہار یوں بھی کرتا ہے۔

جو خیال آیا تمہاری یاد میں ڈھلتا رہا
دل چراغ شام بن کر صبح تک جلتا رہا
حسن کی تابانیاں میرا مقدر بن گئیں
چاند میں چمکا کبھی خورشید میں ڈھلتا رہا
جانے کیا گذری کہ فرزانے بھی دیوانے ہوئے
میں تو شاعر تھا خود اپنی آگ میں جلتا رہا

جمیل ملک جس طرح فن کے ازلی اور ابدی رشتوں کو سمجھا، پرکھا اور برتتا ہے! اس کا احساس اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے اشعار بڑی سادگی بے تکلفی اور بے ساختگی سے نغموں میں ڈھلتے جاتے ہیں (اس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں) یہ نغمگی ایک فن کار کو اس وقت نصیب ہوتی ہے۔ یہ شعریت اسی وقت فن کی جان بنتی ہے جب فن کار اپنے احساسات اور جذبات کو ایک فطری تاثر اور بھرپور جذبے کے ساتھ اظہار کی صورتیں دیتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے، جب ایک شاعر ایک نہایت نازک حساس اور باریک بیں فرد کی صورت میں معاشرے کا ایک ایک زخم اپنے دل و دماغ پر اس طرح ثبت کر لیتا ہے کہ رگوں میں دوڑنے پھرنے والا لہو آنکھوں سے ہی نہیں اس کے نوک قلم سے بھی ٹپک جاتا ہے! احساسات کی بے پناہ یورش کے باوجود جمیل ملک اپنا فلسفۂ حیات اور اس کے نظم و ضبط کو ریزہ ریزہ نہیں ہونے دیتا۔ اس کا المناک احساس اس کے ذہن کے کسی گوشے سے ایک نغمے کی طرح پھوٹ نکلتا ہے۔ روایتی انداز میں یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ جمیل ملک بہت کم "آورد" سے کام لیتا ہے۔ "پردۂ سخن" کی اکثر غزلوں میں آپ کو یہ تاثر جا بجا ملے گا وہ اس وقت تک اپنی تخلیق کو کوئی شکل نہیں دیتا۔ جب تک اس کے احساسات اس کی ذات اور خارجی ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو کر ایک قالب میں ڈھل نہیں جاتے۔

ہر بڑے فن کار کی طرح شعریت اور نغمگی جمیل ملک کے شہ پاروں کی صورت اختیار کر کے ایک ہی قالب میں ڈھلتی چلی جاتی ہے بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ روحِ نغمہ ہی دراصل جمیل ملک کی شاعری کی بنیاد ہے۔ حالانکہ صرف ایسا ہی نہیں۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ شعر اور نغمے کی ہم آہنگی بھی اس جذبے کی ترجمان بن جاتی ہے کہ جمیل ملک ایک ترقی پسند انسان اور ایک ترقی پسند شاعر کی صورت میں حالات و واقعات سے

متاثر ہو کر غم کا گہرا تاثر تو لیتا ہے لیکن اس تاثر سے فشار، مایوسی اور اداسی کو جنم دینے کی بجائے ایک نیم خند کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں چھپا ہوا طنز ہی اس کا 'پردہ سخن' ہے اور وہ اپنے ذہین قاری پر یہ واضح کرتا چلا جاتا ہے کہ وصل و فراق دراصل ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں ہجر کے عذاب کے پیچھے کسی بت طناز کی بے رخی ہی کارفرما نہیں بلکہ بے رحم سماج کا بے رحم عمل بھی ہجر کے اس عذاب کا ذمہ دار ہے اور وصل کی ساعتوں میں بھی، عتاب کی سی کیفیت، طبقوں کی کش مکش کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ شاعر زندگی سے پیار کرتا ہو تو وہ نغمگی اور شعریت کو یکجا کر کے انسانی شعور کی تمام نیرنگیوں کے ساتھ اپنے احساسات کو قلم بند کر دیتا ہے یہ اتحادِ ثلاثہ بڑے فن اور فن کار کی صناعی کا ثبوت بن جاتا ہے۔

پھول ہی پھول نہیں باعثِ تزئینِ بہار
کچھ تو کانٹوں کا بھی حصہ ہے گلستانوں میں
اب سنور جائے یہ دنیا تو عجب کیا ہے جمیلؔ
اک سلیقہ سا چلا آیا ہے انسانوں میں

○

پیار کے لمحۂ جاوید کا حاصل ہے فراق
دیکھ لے غور سے جاتے ہوئے صورت میری

○

راہوں کے موڑ کا کلِ پیچاں سے کم نہیں
تو دور ہے تو کیا مری منزل قریب ہے

○

برسوں کی دوستی کا چلن کیا سے کیا ہوا
کس منہ سے ہم ملیں گے اگر سامنا ہوا
راہیں سمٹ سمٹ کے نگاہوں میں آگئیں
جو بھی قدم اٹھا وہی منزل نما ہوا

فن اور شعور و احساس کا یہ تقدس 'پردہ سخن' کی غزل سے نمایاں ہے اور 'پردہ سخن' کے تدریج

مطالعے سے یہ بات نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی ہے کہ مجموعے کے مختلف حصوں کی غزلیں اپنے اثرات، مشاہدے اور تجربات و احساسات میں اضافے کے ساتھ نمو کے مختلف مرحلے طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ انہوں نے پردۂ سخن کو یکسانیت کے سانچے میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔

پردۂ سخن میں جمیل ملک روایت کی صحت مند قدروں کا چراغ روشن کئے ہوئے ہے اس لئے کہ پردۂ سخن غزل کی شاعری ہے اور غزل ہماری شاعرانہ روایت کا اب تک سب سے زیادہ جاندار ورثہ ہے۔ غزل ہر چند ایک روایتی ذریعۂ اظہار کا الزام بھی لئے ہوئے ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں وہ تمام نرمی اور لچک موجود ہے جس نے غزل کو گل و بلبل اور لب و رخسار کی تفسیر و تشریح کی موشگافیوں سے ہٹ کر بھی فنکاروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ میر و غالب اور اقبال و فیض کی غزل سرائی نے غزل کو جو انداز دیا ہے۔ وہ بھی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس کے پیشِ نظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کل اور آج غزل کے وہی جذبات و احساسات زندہ روایات کے حامل رہے ہیں جن میں معاملہ فہمی، مضمون آفرینی، اثر انگیزی، حسن آفرینی و داغ و وصل کی حدکا نہ لذتوں کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے فکر و احساس کو ایک فلسفے میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہو ——— ولی دکنی سے میر اور میر تقی میر سے غالب اور غالب سے داغ اور اقبال تک اور اقبال سے فیض اور فیض سے جمیل ملک تک غزل کے عروج کے ہر چھوٹے بڑے دور میں وہی رجحانات نمایاں رہے ہیں اور نمایاں رہیں گے جن میں زندگی کی صحت مند اور توانا قدروں کی ترجمانی کی گئی ہے۔

پردۂ سخن کی غزلوں میں کہیں کہیں روایتی غزل کا اسلوب بھی ملتا ہے مگر بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن میں روایتی انداز کے ساتھ ساتھ غزل کی صحت مند قدروں کو اظہار کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ پردۂ سخن کے مجموعی مطالعہ سے یہ واضح اور متحرک تاثر بار بار سامنے آتا ہے کہ جمیل ملک انسان کی ازلی اور ابدی کشمکش میں شعوری طور پر ان قوتوں کا ساتھ دینے کا عہد ہر دم تازہ رکھتا ہے جو انسان کی نجات کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے کے انحطاط کی کوکھ سے ایک نئے تعمیر ہوتے ہوئے معاشرے کو جنم دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔

غمِ جاناں سے جمیل ملک اس لئے غمزدہ نہیں ہوتا کہ وہ اُس کا محبوب، نصب العین یا طرزِ فکر ایک ہی قسم کے روایتی بندھنوں اور معاشرتی زنجیروں کے خلاف صف آرا ہے۔ غمِ دوراں سے جمیل ملک اس لئے ہراساں نہیں ہوتا کہ ایک انحطاط پذیر معاشرہ چاہے کتنا ہی انحطاط پذیر کیوں نہ ہو جائے عہد

کی زندہ و پائندہ قدریں اور کبھی ابھاگر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ منظر [illegible] ایک ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے معاشرے میں بظاہر ایک فن کار بھی ان روایتی قدروں کا اسیر و محبوس دکھائی دیتا ہے لیکن ایک صاحبِ نظر فن کار اپنی فکرِ رسا سے یہ ثابت کرتا رہتا ہے کہ وقت کی بڑی سے بڑی دیوار بھی اس کی فکرِ رسا کے لیے دیوار نہیں بن سکتی۔ جمیل ملک کے فن اور تخلیقی عمل سے یہ بات واضح ہوتی چلی جاتی ہے کہ غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک کے تمام مرحلوں میں ایک فرد دوسرے فرد کو موردِ الزام قرار نہیں دے سکتا جب تک فرد یا افراد اپنے آپ کو ترقی یا رجعت کے دو خانوں میں واضح طور پر تقسیم نہیں کر لیتے۔ غمِ ذات اور غمِ حیات میں محض غمِ ذات کو ہی اپنی ساری کائنات سمجھ لینا، معاشرے میں ہی نہیں۔ ادب میں بھی ایک گھسا پٹا دقیانوسی نظریہ ہے۔

جمیل ملک بار بار غمِ ذات سے غمِ کائنات تک پہنچتا ہے اور پھر غمِ ذات سے زیادہ اسے غمِ کائنات کا تجربہ زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا لہجہ ہمیشہ بھرپور اور توانا رہتا ہے۔ وہ خود تنقیدی کے عمل کو بھی مشعلِ راہ بناتا ہے اور نصب العین کے چھوٹے پرچارکوں کو بھی بڑے دھیمے، موثر اور پرسوز انداز میں تنقید کا نشانہ بناتا چلا جاتا ہے وہ فن ادب اور معاشرے میں غمِ ذات سے لے کر غمِ کائنات تک اپنے خلاف ہی سینہ سپر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس خلا میں ان ہمسفروں کی نشاندہی بھی کرتا چلا جاتا ہے جن کے بارے میں غالب کی زبان میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا'

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے جمیل ملک سوچ سمجھ اور پرکھ کر بات کرنے کا عادی ہے وہ اپنے ہمسفروں اور اپنے سفر کی صعوبتوں کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ اُس نے ایک بھرپور دردِ مشترک کو اپنے فن کی بنیاد بنایا ہے اُس کا غمِ جاناں، غمِ ہمسفراں بھی ہے اور غمِ دوراں' ہمسفروں کا نوحہ بھی ہے ــ جو روپ بہروپ کے مختلف مدارج میں صرف بہروپئے ثابت ہوئے ہیں ـــ جمیل ملک ایک خاص سبھاؤ کے ساتھ بات کرتا ہے وہ اپنے ناقدوں اور نکتہ چینوں سے یک لخت برہم نہیں ہوتا بلکہ اپنے مخصوص انداز میں ہر وار کا جواب دیتا ہے اور اس کا قاری کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ اُس نے اپنے کسی فن پارے میں اپنے مثبت رویے کو ترک کیا ہو۔ اس کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ امر رہتا ہے کہ وہ اپنے فنی پیکروں پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دے ـــ اس طرح اُس کے ہاں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ شعر و نغمہ کی تمام کیفیتیں غزل در غزل پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

قضا سے بھی نہ بجھا عشق و آگہی کا چراغ
مرے لہو سے جلا میری زندگی کا چراغ
کس آنے والے مسافر کے انتظار میں ہیں
زمانے بھر کی نگاہیں تری گلی کا چراغ

○

جمیلؔ آج یہ مطلب وصالِ یار کا ہے
نظر کے سامنے منظر تمام دار کا ہے
وہ دن بھی تھے کہ تلاشِ بہار تھی مجھ کو
مری تلاش میں اب قافلہ بہار کا ہے

○

چلو ذرا آج ریگِ ساحل سے موجِ دریا میں کود جائیں
مزاجِ دریا بھی پوچھ لیں گے بھنور سے بھی دل لگی رہے گی

○

خوشبو نہ ہو تو پھول کی رنگت بھی ہے غبار
دل ہی نہ ہو تو میں رُخِ زیبا کو کیا کروں
ریگِ رواں پہ نقش بنانے سے فائدہ
خونِ جگر سے حرفِ تمنا لکھا کروں

○

سالہا سال کے سوئے ہوئے ارماں جاگے
بستیوں میں ہے بہت شور کہ انساں جاگے
سو گیا جو ترے دامن کا سہارا لے کر
اے شبستانِ ازل آج وہ پیماں جاگے

'پردۂ سخن' کی غزلوں میں یہ تاثر عام ملتا ہے کہ جمیل ملک اپنی ذات کے خول کے اندر گھٹ گھٹ کر اور نوحہ و فریاد، نالہ و اشک کے زندانوں میں گھل گھل کر بات کرنے کا عادی نہیں بلکہ وہ اپنی تمام تر سماجی قیود اور فن کی عائد کردہ پابندیوں کے باوجود اپنے فن کی کھلی بے کراں وادی میں وقت کی صلیب پر کھڑے ہو کر 'انا الحق' کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس کی یہ جرأت، حوصلہ اور فراست اس کے احساسات کا پرتو ہی نہیں اس کی غزلوں کی صورت میں زندگی اور اس کے عمل کی تفسیر بھی ہے۔

جمیل ملک کا لب و لہجہ غزل کی قدامت کے باوجود نیا اور جدید ہے۔ وسعتِ نظر، غور و فکر، ابہام و تفہیم، مزاج شناسئ رقیب، اداطرازئ محبوب اور غلط اندازئ احباب کو وہ ایک بالکل نئے اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام شاید اسی لئے 'پردۂ سخن' رکھا ہے اور میں اسے 'سخن سخن' 'پردۂ سخن' کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ رنگین رنگین پردہ، نقش نقش ایسی تصویریں پیش کرتا چلا جاتا ہے جن سے جمیل ملک کا فن سے والہانہ لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔

کھڑے ہیں کب سے پس و پیش سایہ دار درخت
چلے چلو کہ ہیں رستوں میں غمگسار درخت
یہ کائنات بھی شاید ہے جنگلوں کا سفر
نظر کے سامنے آتے ہیں بار بار درخت

○

عجب ادا سے ہوا ہوں غزل سرا سن لو
ہر ایک موجِ ہوا میں مری صدا سن لو

○

اپنی ہی سوچ کی تمازت سے
لمحہ لمحہ پگھل رہا ہوں میں

جمیل ملک آج فن کی وہ منزلیں طے کر رہا ہے جہاں ایک نگاہ واپسیں سے بھی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ اس نے اردو غزل میں بے شمار گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ اس کے باوجود اس نے اپنے فن پر نہ تو کسی اور کی چھاپ کو ثبت ہونے دیا ہے اور نہ اپنے عصر کے ایک سے خیالات کا اعادہ کرتے

وقت کسی ہمعصر کے اظہار کا سایہ اپنے فن پر پڑنے دیتا ہے وہ اظہار میں اپنے ساختہ پرداختہ فلسفے کا خود ہی نمائندہ ہے اور اپنے فن کو ہی اس فلسفے کی نمائندگی کا ذمہ دار سمجھتا ہے یہ بذات خود ایک بہت بڑا کام ہے جس سے وہ بخوبی عہدہ برا تو ہو جاتا ہے لیکن ایک اچھے اور بڑے فن کار کی طرح فن کی کسی منزل کو منزل قرار دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنے اندر اور باہر کے تمام وسیلوں اور ابلاغ کے تمام حیلوں سے آگاہی رکھتے ہوئے تکمیل کی خواہش کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، رسائی سے اس کی نارسائی اور نارسائی سے رسائی کا جذبہ جنم لیتا ہے پھر بھی یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ایک ناآسودہ انتشار کا شکار اور ایک اُلجھے ہوئے انداز فکر رکھنے والے معاشرے کا ایک نامکمل فرد ہے۔ اس کی یہ رجائیت اس کے فن کا سب سے زیادہ مثبت اور خوشگوار پہلو بھی ہے۔ وہ اپنی ذات کے اندر تنہا ہوتے ہوئے انجمن آرا رہتا ہے اور انجمن آرائی میں اپنی تنہائی کا ذکر بھی بڑے رکھ رکھاؤ طرحداری اور سلیقے سے کرتا ہے۔ ہر چند اس کی شاعری میں بعض ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں وہ ایک فرد کی تلاش جنت میں گم کردہ راہ بھی دکھائی دیتا ہے مگر یہ مقام جمیل ملک کی شاعری میں ہی نہیں آتا، اس دور کے بڑے بڑے ثقہ شاعر بھی ایک انبوہ کی شکل میں اسی جنت گم گشتہ کی تلاش میں مختلف قبیلوں، گروہوں اور خانوں میں تقسیم ہو کر منزل سے دور ہی دور رہتے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر دور کے فن کار جب کسی نصب العین کے تحت اپنی آواز کی مشعل جلا کر فن کا سفر اختیار کرتے ہیں تو بعض مقامات پر لابدی طور پر روشنی کا سیل رواں چہروں کے نقش و نگار کو سایوں میں تبدیل کرتا رہتا ہے اور اس طرح تشخص کا عمل وقتی طور پر رک سا جاتا ہے مگر جونہی یہ ہیجانی دور ختم ہوتا ہے چہروں کے نقوش پھر واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔

تو آئینہ ہے اور مرا دل ہے آئینہ
پھر آج آئینے کے مقابل ہے آئینہ

چہروں سے جھانکتی ہے شکستوں کی داستاں
آ تو بھی دیکھ حیرتِ محفل ہے آئینہ

چلتے رہیں گے وقت کی رفتار دیکھ کر
ہم رہروانِ شوق کی منزل ہے آئینہ

گئے ہیں یوں تو سر دار بھی مگر اب کے
وہ زد پڑی ہے کہ جینے کے حوصلے بھی گئے

بلا سے جان گئی چین تو نصیب ہوا
فراق و وصل کے اب سارے فاصلے بھی گئے

سپاہ تاک میں ایسے رقیب ہو جیسے
بیانِ حسن و صداقت کے مرحلے بھی گئے

خود تنقیدی رجحان اور تجزیۂ ذات کے یہی پہلو جمیل ملک کو اپنے دور کے دوسرے شاعروں سے ایک الگ امتیاز کے حامل قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید غزل سے ترقی پسند غزل تک کا تمام سفر ہر چند غزل کو مفہوم، الفاظ، تشبیہ، استعارہ اور بحیثیت مجموعی فن اور اظہار فن کی نئی نئی صورتیں دیتا گیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جدید اور ترقی پسند غزل کا یہ سفر بہت جلد ایک خاص طرز فکر کی چھاپ اور ایک خاص انداز کی مُہر کی نذر ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک شاعر کے کلام اور دوسرے شاعر کے انداز گفتگو میں بہت کم فرق رہ گیا۔ جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ شاعر سے معاشرہ جس عمل شوخیٔ کردار اور تشخص ذات کا مطالبہ کرتا رہا وہ عنقا ہوتا گیا۔ ایک بار پھر جدت کی آڑ میں لفظ و بیاں کی شعبدہ گری اپنے عروج تک پہنچی۔ ایک ہی خیال کا اعادہ بار بار کیا گیا۔ جس طرح روایتی غزل میں گل وبلبل، دشنہ وخنجر اور زلف وچشم کی تکرار نے غزل کی روح کو ختم کر دیا۔ اسی طرح جدید شعراء نے محض اپنی ہی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے چند مخصوص خیالات کا اتنا اعادہ کیا کہ غزل ایک بار پھر اپنا حسن تازگی اور شدت جذبات جیسی خوبیوں سے عاری ہو گئی۔ جدت کے واسطے سے اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے بعض فن کاروں نے تو ایسی قلا بازیاں کھائیں کہ غزل کو ایک بار پھر بجھارت پہیلی اور معمہ بنا کر رکھ دیا۔ کچھ نے اسے ایک نشہ آور گولی سمجھ کر نگل لیا اور اس نشے میں انہیں بھوتوں، چڑیلوں کے جو مسکن دکھائی دیئے اسے جدید غزل کی جان قرار دیا گیا۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے لفظوں کی جھنکار اور قافیہ ردیف میں ایک عجیب وغریب پیمائش کو ہی معراج فن سمجھنے پر اکتفا کیا اور سب سے آخر میں وہ گروہ آتا ہے جس نے کوٹھے سے دربار تک پہنچنے والی غزل کو بہر طور ایک فاحشہ ہی سمجھا جو کوٹھے سے اتر کر دربار تک پہنچی اور پھر دربار سے بھی نکل آئی مگر اب محفل محفل اس کی رہنمائی کے پس منظر میں تماش بینوں نے اپنی تماش بینی کے سامان بہم کئے اس سارے عمل کے نمونے آج بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔

بس کے باوجود جمیل ملک نے اپنی غزل کو ماحول کی اس کثافت سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اردو غزل

نے نفسا نفسی کے عالم میں کیا کھویا کیا پایا یہ ایک الگ موضوع ہے ایک بات ضرور ہے چند مثالوں کو چھوڑ کر یہ بات ماننا ہی پڑے گی کہ اردو غزل آج ایک جامد و ساکت موڑ پر کھڑی ہے. چند مثالوں میں سے جمیل ملک کی غزل بھی ایک مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے جس نے روایت سے جدت اور جدت سے ترقی پسندانہ مراحل کی تمام تر دشواریوں کے باوجود اپنی ہیئت کے اعتبار سے غزل کو کوئی اجنبی صنف نہیں بننے دیا.

شاعری سا نہ کوئی فن تھا جمیل
یوں تو سیکھے ہزار فن میں نے

مجموعی طور پر پردۂ سخن سوز و گداز، نغمہ و آہنگ اور تاثیر و تاثر کے مختلف مقامات کا حامل مجموعہ ہے اس میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ جمیل ملک کی غزل ادھوری اور ناتراشیدہ جذبات کی عکاس ہے ان غزلوں کے مطالعے سے قاری کے دل میں زندگی اور اس کے حسن، جینے کی امنگ اور تڑپ کے مختلف رنگ کروٹیں لیا کیے. جمیل ملک کا نغمہ آہنگ و لفظ و صورت میں فاصلے پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کی شاعری کا بہاؤ قاری کے احساسات و تاثرات کے ساتھ ساتھ رواں دواں رہتا ہے۔

'پردۂ سخن' کی غزلوں کا یہ تاثر اس لئے بھی بھرپور ہے کہ جمیل ملک نے شاعری کا فن ایک شغل کے طور پر یا ایک جز وقتی کام کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی شخصیت، انفرادیت اور کردار میں عدم توازن سے گریز کو اپنی شاعری کا پس منظر بنایا ہے جس سے اس کے فن غزل میں یکسوئی، طمانیت اور فکری انہماک واضح تر ہوتا گیا ہے اس نے کسی بھی مرحلے پر قول و فعل کے تضاد کو اپنے فن کی بنیاد نہیں بننے دیا. نہ ہی جمیل ملک عمداً یا سہواً اپنے نظریۂ فن سے منحرف ہوئے جمیل ملک اپنے محبوب کو گوشت پوست کے ایک جیتے جاگتے انسان میں ہی نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ اس کی خواہش ہے کہ اس کا محبوب ایک صحت مند روح کا حامل ایک ایسا اچھوتا پیکر بھی ہو جو جسم سے روح تک کسی حصار کا پابند نہیں ہوتا جو ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے ساتھ ساتھ ایک روشن سائے کی طرح ہمسفر رہتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کا محبوب اس کا نصب العین ہے اور اپنے نصب العین میں وہ اپنے نادیدہ محبوب کی جلوہ پاشیوں سے اپنے فن کو جلا دیتا رہتا ہے. پردۂ سخن میں آپ کو کوئی ایک مصرع یا ایک بھی ایسا شعر نہیں ملے گا جس میں کہیں یہ تاثر پایا جاتا ہو کہ جمیل ملک کے پیکر احساس نے کسی سوقیانہ حرکت کا مظاہرہ کیا ہے یا جمیل ملک ایک فن کار کی صورت میں اپنے محبوب کے قرب کی لذتوں سے آشنا ہو کر کسی سفلی جذبے کا شکار ہوا ہے اس کے ذاتی کردار کی پاکیزگی اس کے فن کی منہ بولتی تصویر ہے۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ 'پردۂ سخن' کو ترتیب دیتے وقت جمیل ملک کسی شعوری ترتیب کو پیش نظر رکھے ہوئے تھا یا نہیں؟ مگر 'پردۂ سخن' کے ارتقائی مطالعے سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ جمیل ملک 'پردۂ سخن' کے آغاز سے لے کر آخر تک اپنے جذبۂ تعمیر کو سلسلہ بہ سلسلہ نمایاں کرتا چلا گیا ہے۔ 'پردۂ سخن' کی ترتیب میں یہ شعوری یا غیر شعوری ارتقاء قاری کو اس کی شخصیت میں احساسات و تاثرات اور جذبات و مشاہدات کو سمجھنے کے لئے بڑا موثر کردار ادا کرے گا۔

غزل کے مزاج کے لحاظ سے بھی جمیل ملک کے مجموعۂ کلام کا نام 'پردۂ سخن' انتہائی برمحل اور معنی خیز ہے کہ اردو شاعری کی مختلف اصناف سخن میں غزل ہی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر بات رمز و کنایہ اور تشبیہہ و استعارہ کے پردے میں کامیاب طریق سے کہی جا سکتی ہے گویا غزل ایک پردہ ہے اور پردہ بھی ایسا کہ حسن سخن پوشیدہ ہوتا ہوا بھی نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔

جمیل ملک کا پہلا مجموعۂ غزل 'سرِ چراغاں' اگر اس کے تجربات کے تمام تر بیانات کے ساتھ منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے تو 'پردۂ سخن' کا آغاز ایک ہیجانی دور کے خاتمے کے ساتھ بربریت کے ایسے دور کا آغاز ہے جس نے ماحول کو پندرہ سال تک آسیب زدہ بنائے رکھا۔ اس پر آشوب ماحول میں جمیل ملک نے ایک اور چراغ روشن کر لیا اور اس چراغ کی روشنی نے جمیل ملک کی شاعری کو ایک نئی جہت دی۔ گہرے غاروں میں، بال بکھراتے ہوئے اندھیرے ایک بار پھر روشنیوں کے سیل رواں میں گم ہو گئے۔ جمیل ملک کو ایک رفیقۂ حیات مل جانے سے اس کے سخن با دوسرے لفظوں میں غزل کی زبان و بیان میں ایک نئی توانائی اور ایک نئی سطح کا اضافہ ہوا۔ پندرہ سال کے اس عرصے میں آمریت، گروہی سیاست اور منافقت کے منحوس سایوں کے پھیلنے اور سمٹنے کے سارے تجربات جمیل ملک کے 'پردۂ سخن' کا پس منظر بنتے گئے ہے

آخر کھلا ہے کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ

○

وہ ناز و غمزۂ دشنہ و دشنام کیا ہوئے
بیٹھی ہوئی سپاہ تری رہگزر میں ہے

حرفِ آخر کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ 'پردۂ سخن' ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس نے زمین زندگی، کائنات اور اس کے مظاہر کو دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے بلکہ انہیں دیکھ، سمجھ اور پرکھ کر اپنی شخصیت اور فنی اظہار کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ وہ اپنے اس عمل میں پوری طرح کامیاب و کامران ہے اور ہر باشعور، منفرد اور صاحبِ طرز فنکار کی طرح وقت کی گواہی اس کے ساتھ ہے۔

احمد ظفر

حرفِ سخن

نہ کیا چاک پیرہن ہیں نے
رکھ لیا پردۂ سخن میں نے

وہ عبادت تھی ، زندگی کیلئے
تجھ کو چاہا ، نگارِ فن میں نے

دل دھڑکتا ہے بات بات کے ساتھ
چن لیا ایک ہم سخن میں نے

گونج بن کر جہاں میں پھیل گئی
یوں صدا دی دمن دمن میں نے

عمر بھر زندگی سے پیار کیا
سر پہ باندھا تھا گو کفن میں نے

میری مٹی سبھی کے کام آئی
سب کو سمجھا ہے ہم وطن میں نے

دل سے بہتی رہے روز خون کی نہر
گھر میں رکھا ہے گورکن میں نے

شاعری سا نہ کوئی فن تھا جمیلؔ
یوں تو سیکھے ہزار فن میں نے

○

غمِ جہاں، ستمِ دلبراں ہے میری غزل
ٹپک رہا ہے لہو، خونچکاں ہے میری غزل

جو تو بھی آئے تو آکر یہیں ٹھہر جائے
غموں کی شاخ پہ وہ آشیاں ہے میری غزل

جُدا ہے لاکھوں ستاروں سے راستہ جس کا
فرازِ عرش پہ وہ کہکشاں ہے میری غزل

جہاں ہے گردشِ لیل و نہار کی زد میں
مگر جواں ہے، ابد تک جواں ہے میری غزل

جمیلؔ جو بھی سنے، آشنائے راز بنے
نوائے دل، جرسِ کارواں ہے میری غزل

○

شعر آغاز کریں بھی تو کہاں سے پہلے
ہونٹ سِل جاتے ہیں اظہار بیاں سے پہلے

غمِ دنیا سے کب انکار ہے لیکن لوگو
غمِ دنیا بھی کہاں تھا غمِ جاں سے پہلے

اِس مسافر پہ یقیں آئے نہ آئے تم کو
پوچھ لو حال مرا ہمسفراں سے پہلے

اُن کی نظروں میں سبک اتنے ہوتے ہیں کہ نہ پوچھ
ہم، کہ رہتے تھے بڑے تندوگراں سے پہلے

ختم ہوتی ہے بہرحال ہمیں پر آ کر
بات چلتی ہے اگر کوئی وہاں سے پہلے

بار گزرا ہے جمیل اُن پہ یہ اندازِ غزل
پوچھ لینا تھا ذرا طبعِ رواں سے پہلے

○

رات ہے، ماہتاب ہے، تو ہے
دل خیاباں، دماغ خوشبو ہے

کیوں نہ بکھرے جہاں کا شیرازہ
تیری زلفیں ہیں، میرا بازو ہے

اب کسے شکوۂ غمِ ہجراں
اب وہ خلوت نشینِ پہلو ہے

شہرِ دل سے بھی اک ذرا گزریں
جن کو اپنی نظر پہ قابو ہے

آپ انصاف کیجیے تو سہی
آپ کے ہاتھ میں ترازو ہے!

○

خیال و خواب میں برپا انوکھا سا تلاطم ہے
کبھی اُجلا تبسم ہے، کبھی پنہاں تکلم ہے

نگاہوں میں جلن، دل میں چبھن محسوس کرتا ہوں
یہ کس کے آتشیں ہونٹوں پہ آوارہ تبسم ہے

یہ تیری مسکراہٹ ہے کہ دو کلیاں چٹکتی ہیں
زباں سے پھول جھڑتے ہیں کہ یہ حسنِ تکلم ہے

یہ عالم ہو تو کوئی کیوں نہ اُن کو پیار سے دیکھے
اداؤں میں ہے موسیقی، نگاہوں میں ترنم ہے

کہاں جا کر کھلی ہے میرے گھر کی چاندنی ایدل
وہ میرا پیکرِ مہتاب برسوں سے کہاں گم ہے

○

اپنے گیسو مرے شانوں پہ بکھر جانے دو
شب کا یہ حسنِ سفر تابہ سحر جانے دو

حسن ہی حسن نظر آئے گا تا حدِ نظر
عشق کا ذوقِ نظر اور نکھر جانے دو

پھول ہوں میں، مری خوشبو سے گریزاں کیوں ہو
اپنے بے خواب شبستاں میں بکھر جانے دو

کب تلک تیرہ حجروں میں سمٹ کر بیٹھوں
مہ و خورشید کے سینے میں اتر جانے دو

حسنِ ادراک و حقیقت کی طلب میں یارو
شوقِ افسانہ و افسوں سے گذر جانے دو

○

عروسِ حسن نے پہنا ہے پیار کا گہنا
بہارِ نازکی رعنائیوں کا کیا کہنا

کبھی ہیں نورِ قمر اور کبھی جمالِ سحر
ہمیں پسند نہیں زخم بے نشاں رہنا

یہی تو رسم و رہِ شہرِ آشنائی ہے
کسی کو دل میں بسانا، کسی کا ہو رہنا

اگر مَیں منزلِ گل سے پلٹ کے آ نہ سکا
تو میرا حال بہاروں سے پوچھتے رہنا

وہ کج ادا تو کبھی راہ پر نہ آئے گا
جمیلؔ دل کا اگر مان بھی لیا کہنا

○

تری جستجو میں نکلے ، تو عجب سراب دیکھے
کبھی شب کو دن کہا ہے کبھی دن میں خواب دیکھے

مرے دل میں اس طرح ہے تری آرزو خراماں
کوئی نازنیں ہو جیسے . جو کھلی کتاب دیکھے

جسے میری آرزو ہو ، جو خراب کو بکو ہو
مجھے دیکھنے سے پہلے ، تجھے بے نقاب دیکھے

جسے کچھ نظر نہ آیا ہو جہانِ رنگ و بو میں
وہ کھِلا گلاب دیکھے ، وہ ترا شباب دیکھے

یوں ٹھہر ٹھہر کے گذری شبِ انتظار یارو
کہ سحر کے ہوتے ہوتے کئی ہم نے خواب دیکھے

دو جہاں کو لا ڈبوئے ، وہ ذرا سی آبجو میں
تری چشمِ سرمگیں کو ، جو کوئی پُر آب دیکھے

مجھے دیکھنا ہو جس نے مرے حال پر نہ جائے
مرا ذوق و شوق دیکھے ، مرا انتخاب دیکھے

(نذرِ اعجاز عظیم)

سہرے کی چاندنی سے ہے چہرہ دھُلا ہوا
یا حجلۂ عروس کا در ہے کھُلا ہوا

کس کس کے دل میں تیر کی صورت اُتر گیا
پھولوں کی سیج پر کوئی کانٹا تُلا ہوا

خوشبو کی لہر لہر سے پوچھو مزاجِ یار
دیکھو سہاگ رات کا جوڑا کھُلا ہوا

سانسوں کی تیز تیز ہوائیں دلوں کی آگ
شب کا سرور خوابِ سحر میں گھُلا ہوا

ہے کتنی لازوال بہاروں کا پیش رو
کانٹے کی نوک پر کوئی موتی تُلا ہوا

صیقل ہوا ہے پیار سے یوں دل کا آئینہ
جیسے شبِ وصال کا منظر دھُلا ہوا

بلقیس بھی ہے تختِ سلیماں پہ جلوہ گر
امن و اماں کا پرچمِ جاں ہے کھُلا ہوا

○

یہ ترے پیار کا نگیں تو نہ تھا
چاند اتنا کبھی حسیں تو نہ تھا

سرمئی شام کر گئی جادو
ورنہ تو خوابِ سرمگیں تو نہ تھا

جانے کیوں دل سلگ سلگ اٹھا
بادہ حسن آتشیں تو نہ تھا

تیرے ہونٹوں سے پی لیا، ورنہ
زہر تھا زہر، انگبیں تو نہ تھا

جانے کیوں دل میں آ کے بیٹھ رہا
وہ مرے شہر کا مکیں تو نہ تھا

لوگ کیوں اُس پہ جان دے بیٹھے
تھا وہ مجھ سا مگر حسیں تو نہ تھا

تھا صنمخانۂ گماں بھی یہی
دل فقط قبلۂ یقیں تو نہ تھا

O

دل میں سہمے ہوئے ارمان مچل جاتے ہیں
عرصۂ زیست میں گرتے ہیں سنبھل جاتے ہیں

کب بدلتے ہیں زمانے کو یہ اربابِ ہوس
رُخ بدلتا ہے زمانہ تو بدل جاتے ہیں

کون سے گھاٹ اترتے ہیں یہ رَمتے جوگی
کس کو ملنے کے لئے نیل کنول جاتے ہیں

ہائے وہ اوس کے موتی جو سرِ شاخِ گلاب
گرم سورج کی تمازت سے پگھل جاتے ہیں

نغمہ و نور سے بھرپور ہے سینہ اپنا
کوئی سنتا ہے تو ہم شعر میں ڈھل جاتے ہیں

○

رات اور رات بھی جدائی کی
سانس رک رک گئی خدائی کی

اتنا آساں نہ تھا ترا ملنا
ہم نے اِک اِک سے آشنائی کی

ہم نے اک دوسرے کو پہچانا
کیا ہوئی رسم بے وفائی کی

ہم ہی الجھے تری خدائی سے
تو نے تو عمر بھر خدائی کی

ہم تو سادہ تھے خار کی صورت
گل عذاروں نے کج ادائی کی

۵۰

○

مری نوا نے جہاں بھی تجھے بلایا تھا
ترا خلوص وہاں چاند بن کے آیا تھا

شبِ فراق تھی، تم تھے، تمہارا سایا تھا
وہ کون تھا جو دبے پاؤں پاس آیا تھا

وہ میں نہ تھا جو ترے خواب میں سمایا تھا
مری وفا نے تجھے آئینہ دکھایا تھا

مرا رقیب تو صرصر کا تیز جھونکا تھا
وہ جس نے چھو کے تجھے میرا دل دکھایا تھا

یہ مہر و ماہ، یہ تارے بہت حسیں ہیں مگر
وہ اشک، جو مری پلکوں پہ جگمگایا تھا!

اِن آنسوؤں سے غمِ دو جہاں عبارت ہے
کہ میرا درد بھی اپنا نہیں، پرایا تھا

افق افق پہ شفق نے دیئے جلائے تھے
جمیلؔ جب وہ تصور میں مسکرایا تھا

○

راحتِ جاں بھی ہے تو، مونس و دمساز بھی ہے
میری آواز میں شامل، تری آواز بھی ہے

تجھ کو پوچھوں کہ سنوں تیری ہوس کے قصے
لوگ کہتے ہیں کہ تو فتنۂ طنّاز بھی ہے

مانگ لے مجھ کو خدا سے مرے محبوبِ نظر
میرے ہونے سے تری جلوہ گہہِ ناز بھی ہے

پردۂ رنگ اٹھا دوں تو عیاں ہو جائے
تیری صورت کہ زمانے کیلئے راز بھی ہے

چاند تاروں پہ نہ حسرت سے اٹھیں گی نظریں
پیکرِ خاک میں اب جراتِ پرواز بھی ہے

کسی مُطرب کا ترانہ ہے کہ شاعر کی فغاں
کس نے چھیڑی ہے غزل سوز بھی ہے ساز بھی ہے

(۰)

خوشبو تے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ
آتی شبِ فراق تو گل ہو گئے چراغ
دل کی لگی، بھڑک کے نگاہوں تک آ گئی
پلکوں پہ شامِ وصل جلاتے ہیں دل کے داغ
اُس چشمِ مے فروش سے ہنگامِ ناؤنوش
پھوٹا وہ سیلِ نور کہ لو دے اٹھے ایاغ
وہ گُل کھلیں کہ جن کی مہک لازوال ہو
اِس ایک دُھن میں ہم نے سجائے ہیں کتنے باغ
آخر کھلا کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ
جب چشم و دل بجھے تو شبستانِ شوق میں
ہم نے ہتھیلیوں پہ جلائے ہیں شب چراغ

جو وادیٔ جمال میں گم ہو گئے جمیل
اپنی طلب کے ساتھ ہی اُن کا بھی کچھ سراغ!

○

میں گلشن ، تو بادِ صبا ہے
تیرا میرا ساتھ رہا ہے
کون یہ اپنے ساتھ کھڑا ہے
تو ہے یا میرا سایا ہے
شہروں شہروں پھیلی خوشبو
ویرانے میں پھول کھلا ہے
بستی بستی کرنیں پھوٹیں
آج مرے گھر چاند اُترا ہے
سوکھے پتے ہرے ہوئے ہیں
جانے تو کس بن کی ہوا ہے
تیری گلی میں کوئی مسافر
اپنا رستہ بھول گیا ہے
کس سے پوچھے ٹھور ٹھکانہ
گھر گھر تیرا ہی چرچا ہے

ساحل والے لاکھ پکاریں
بہتا دریا کب رکتا ہے
یوں لگتا ہے تنہائی میں
جیسے کوئی دیکھ رہا ہے
یوں تیری باتیں سنتا ہوں
جیسے یہ میری ہی صدا ہے

آج کے جلوے، کل کے سپنے
میری آنکھوں میں کیا کیا ہے

○

یوں نہ دیکھ شرما کر، دل لگی نہیں اچھی
دوستی کے پردے میں دشمنی نہیں اچھی

( )

دور تک [illegible] کہ ارض و سما میں جگنو
ایسی [illegible] باد آئی کہ لہرائے فضا میں جگنو

اُس کے سینے میں جل اٹھے تری چاہت کے چراغ
جس نے دیکھے تری آنکھوں کی ضیا میں جگنو

میری باتوں کے شگوفے ترے جوبن کی بہار
اڑتے پھرتے ہیں سبک نرم فضا میں جگنو

کیوں اُتر آئے سرِ فرش ستاروں کے ہجوم
کس نے ٹانکے ہیں تری شوخ قبا میں جگنو

اس کو چھو لوں، اُسے پلکوں پہ سجا کر رکھ لوں
آ بسے ہیں تری زلفوں کی گھٹا میں جگنو

یہ ترے قرب کی لذت، یہ دہکتی ہوئی آگ
دے اُٹھے لو، تری ایک ایک ادا میں جگنو

یوں چکا چوند سی ہوتی ہے خیالوں میں جمیلؔ
جیسے رقصاں ہوں سرِ شام ہوا میں جگنو

○

گھر سے تا کنجِ قفس پھول کھلا جاتی ہے
جو سحر آتی ہے گلزار بکف آتی ہے

تیری گفتار کا جادو، ترے نغموں کی پھوار
ساری دنیا تری آواز میں ڈھل جاتی ہے

ترے عارض پہ کھلے ہیں مری نظروں کے گلاب
اپنے دامن سے مجھے تیری مہک آتی ہے

شبِ وعدہ کسی آہٹ کسی آواز کے ساتھ
شمعِ احساس کی لو کانپ کے رہ جاتی ہے

جیسے دیوار پہ لرزاں ہو گھڑی کی ٹِک ٹِک
رات بھر دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

تیری باتوں کی طرح نرم، سبک، آہستہ
جب بھی آتی ہے صبا تیری خبر لاتی ہے

تیرے پیکر میں سمائے تو قرار آ جائے
کب سے یہ روح مرے جسم میں گھبراتی ہے

○

خاک اڑتی ہے کوبکو تیری
تجھ کو روتی ہے آبرو تیری

آج ہیں در خورِ نگاہ نہیں
صاف کہتی ہے گفتگو تیری

عمر بھر جو ہمارے ساتھ رہی
گمرہی تھی کہ جستجو تیری

آئینے میں جمیل کو دیکھا
جیسے صورت ہو ہوبہو تیری

○

سامنے ڈھیر ہے پروانوں کا
حال دیکھو مرے ارمانوں کا

پھول جلتے ہوئے انگارے ہیں
دل دہکتا ہے گلستانوں کا

دل سرابوں سے بہل جاتے تھے
وہ بھی کیا دور تھا افسانوں کا

اس طرف سے کبھی ہو کر گزرو
دل بھی اک شہر ہے ارمانوں کا

تم کہاں کھوج میں نکلے ہو جمیلؔ
شہر میں قحط ہے انسانوں کا!

O

میں نے آنکھوں سے سُنی تو نے نگاہوں سے کہی
یوں تو کیا کیا نہ ہوا، دل کی مگر دل میں رہی

یوں ترے بعد مرا دل ہے شکستہ، ویراں
جس طرح کاسۂ گل، گوہرِ شبنم سے تہی

ہم کو معلوم تھا، باتوں کا مآلِ سنگیں
مسکراتے رہے، سنتے رہے جو تو نے کہی

تو نے اک اشک سے طوفان اٹھائے کیا کیا
ہم تو روئے بھی مگر آنکھ سے شبنم نہ بہی

غم وہ کیا غم ہے جو ہو صرفِ نمائش کیلئے
وہ ہمیں کہتے ہیں بیدرد تو بیدرد سہی

○

دِل کی معصوم خطاؤں سے بہل جاتے ہیں
وہ ہوں منصف تو سزاؤں سے بہل جاتے ہیں

اپنے دو چار گناہوں سے بھی آتا ہے حجاب
ہم خطاکار، دعاؤں سے بہل جاتے ہیں

ہم تو بھولے تھے کہ ہونا تھا گنہگار ہمیں
لوگ کیوں تیری اداؤں سے بہل جاتے ہیں

ہائے وہ ابر جو چھاتا ہے برستا ہی نہیں
اُف یہ ارماں جو گھٹاؤں سے بہل جاتے ہیں

تیرے دامن کی بہاروں کو ترسنے والے
تیری بستی کی ہواؤں سے بہل جاتے ہیں

جب سے بازار کی اک جنس ہوا نامِ وفا
ہم جمیلؔ اپنی اداؤں سے بہل جاتے ہیں

○

مجھ سے اک شوخ سرگراں تو نہیں
پھر یہ فتنہ بلائے جاں تو نہیں

دو دلوں میں یہ فاصلے کیسے
تیسرا کوئی درمیاں تو نہیں

کیا ہوا قصۂ فراق و وصال
عشق دو دن کی داستاں تو نہیں

تو نہیں ہے تو جاں نکلتی ہے
سچ بتا تو ہی میری جاں تو نہیں

آنسوؤں سے ہیں جان و دل سیراب
غم کی یہ فصل رائیگاں تو نہیں

دل کشادہ ہے، دوستوں کے لئے
یہ گزر گاہِ دشمناں تو نہیں

○

میں منتِ بحر کیوں اٹھاؤں
ساحل ہی پہ کیوں نہ ڈوب جاؤں
تو مجھ کو بلاتے نہیں نہ آؤں
یوں بھی ترے دل میں راہ پاؤں
یوں بھی ہو کہ تیرے ساتھ مل کر
میں اپنا مذاق آپ اڑاؤں
تو اور بھی دور دور بھاگے
مَیں جتنا ترے قریب آؤں
تو رات کا چاند، دن کا سورج
مَیں تجھ کو کہاں کہاں چھپاؤں
دامن میں مجھے چھپا کے رکھ لے
شاید کبھی تیرے کام آؤں

یوں تو تجھے ڈھونڈھنے چلا ہوں
اپنا بھی سراغ اگر نہ پاؤں!

○

دل تھا ناواقفِ فریاد کبھی
یہ خرابہ بھی تھا آباد کبھی

عشق میں بھول گئے کیا کیا کچھ
ہم کو گھر اپنا بھی تھا یاد کبھی

تو نہ آئے تو چلی آتی ہے
تیری خوشبو کی طرح یاد کبھی

اچھا کہہ کر بھی برا کہتے ہیں
داد بھی ہوتی ہے بیداد کبھی

چاند سورج کی طرح پھرتے ہیں
قید ہوتے نہیں آزاد کبھی

خانہ آباد بھی نازاں ہیں جمیلؔ
اس ادا سے ہوئے برباد کبھی

○

شوقِ اظہار نے کیا کیا نہ کیا
نہ کیا تجھ سے تقاضا نہ کیا

یہ بھی اک طرفہ ادا ہے تیری
درد دے کر ہمیں اچھا نہ کیا

ہم کو معلوم تھا، انمول ہے تو
تجھ کو چاہا، ترا سودا نہ کیا

انگلیاں ہم پہ اٹھی ہیں کیا کیا
ہم نے اے جاں تجھے رسوا نہ کیا

لوگ دل دے کے مکر جاتے ہیں
ہم نے ایسا کبھی سوچا، نہ کیا

یہ کرم ہے، کہ ستم ہے کیا ہے
تو نے ہم سا کوئی پیدا نہ کیا

○

چپ کا عالم زہر پئے بیٹھے ہیں
دل کا کیا حال کئے بیٹھے ہیں

اُن کے سینے میں اُتر کر دیکھو
وہ جو ہونٹوں کو سیئے بیٹھے ہیں

فاقہ مستی میں نہ تھا ہوش ہمیں
لوگ سمجھے کہ پئے بیٹھے ہیں

جب سے صحراؤں کی قسمت جاگی
جیب و داماں کو سیئے بیٹھے ہیں

زندگی ایک ہی قصّہ ہے جمیلؔ
جس کو سو رنگ دیئے بیٹھے ہیں

○

غمِ جاناں، غمِ دوراں کو یکجا کر دیا ھم نے
خدائے زیست حیراں ہے کہ یہ کیا کر دیا ھم نے

نہ جانے اُن میں کیا دیکھا کہ نقدِ جاں لٹا بیٹھے
ہمارے دل میں کیا آئی کہ سودا کر دیا ھم نے

ہم اپنے آپ سے بھی کہہ نہ پائے دل پہ کیا گذری
انہیں ہم سے شکایت ہے کہ چرچا کر دیا ھم نے

ہمیں برسوں لئے پھرتی رہیں تنہائیاں دل کی
وہ ہم سے کیا ملے، اُن کو بھی تنہا کر دیا ھم نے

چبھن کانٹے میں رکھ دی، پھول سے گلشن کو مہکایا
متاعِ درد میں بھی حُسن پیدا کر دیا ھم نے

مہ و خورشید آئینے ہیں اپنے دیدہ و دل کے
ہم آئے تو اندھیرے میں اُجالا کر دیا ھم نے

○

بال و پر ہیں، نہ تگ و تاز، یہاں کچھ بھی نہیں
اب بجز حسرتِ پرواز یہاں کچھ بھی نہیں

اب تو یہ وقت بھی رک رک کے یہاں چلتا ہے
کوئی آہٹ، کوئی آواز، یہاں کچھ بھی نہیں

اس چمن میں نہ کہیں پھول نہ شبنم، نہ صبا
دل ہے ویراں نگہہِ ناز، یہاں کچھ بھی نہیں

تم بھی کہتے ہو، کہ آباد ہے دُنیا میری
میرے مونس، مرے ہمراز، یہاں کچھ بھی نہیں

دیکھتے دیکھتے محفل ہوتی برہم اپنی
ہم، نہ وہ بزم کے انداز، یہاں کچھ بھی نہیں

کس سے کہیئے کہ سنائے کوئی پرسوز غزل
نہ مغنی، نہ کوئی ساز، یہاں کچھ بھی نہیں

○

ہونٹوں کو لمسِ ساغرِ زہراب چاہیے
ہاں کچھ تو پاسِ خاطرِ احباب چاہیے

کس کو یہاں ہے سرخیٔ رخسار کی ہوس
کس کو بہارِ بادۂ خوناب چاہیے

تڑپیں برنگِ ماہیِ بے آب رات دن
پہلو میں کوئی پارۂ سیماب چاہیے

چھیڑیں وہ راگ جاگ اُٹھے حسنِ کائنات
سازِ جنوں کو لغزشِ مضراب چاہیے

جانِ وفا کہیں کہ لکھیں پیکرِ جفا
رمزِ خلوص و طعنۂ آداب چاہیے

لو دے اُٹھے جمیل ترا ایک ایک داغ
شعرِ شباب و جلوۂ مہتاب چاہیے

○

ہماری جاں گئی ہے، دل گیا ہے
زمانے کو فسانہ مِل گیا ہے

مِلا ہے ڈوب کر ہم کو کنارا
سفینہ تالبِ ساحل گیا ہے

جنوں کے مرحلے سب طے ہوئے ہیں
مسافر بر سرِ منزل گیا ہے

ترا ملنا قیامت ہو گیا تھا
ترے آنے سے پہلے دل گیا ہے

ملی جاں، تو غم حاصل ملا تھا
گئی جاں تو غم حاصل گیا ہے

نہ لی اس نے خبر تک زندگی میں
مگر مرنے کا طعنہ مِل گیا ہے

کسی گلچیں نے گل کا خوں کیا ہے
کوئی غنچہ چمن میں کھل گیا ہے

○

منہ بند حسرتوں کو سخن آشنا کرو
توڑو سکوتِ ساز، غزل ابتدا کرو
لاؤ کہیں سے سنگِ ملامت ہی کیوں نہ ہو
یارو شکستِ شیشۂ دل کی دعا کرو
معصوم لغزشوں کی بہت داد مل چکی
اب آشنائے غیر کے طعنے سنا کرو
ہارے ہوئے خلوص پہ شرمندگی ہے کیوں
کس نے تمہیں کہا تھا کہ دل کا کہا کرو
نادان ہو، جہاں کا چلن دیکھتے نہیں
رسمِ جفا کو عام بنامِ وفا کرو
پھر کوئی جاں نواز بہانہ تراش لو
پھر کوئی دلفریب، اچھوتی خطا کرو

مل جائے گا جمیلؔ کوئی زخم، کوئی پھول
آؤ نا تم بھی کوچۂ دل میں صدا کرو

○

جی جلے گا، تو چھپ کے رولیں گے
تجھ سے اے بے وفا نہ بولیں گے

کیا خبر تھی شباب آتے ہی
دل میں کچھ خار سے چبھو لیں گے

اشک گوہر ہے یا ستارہ ہے
آج نوکِ مژہ پہ تولیں گے

رات کاٹیں گے چاند کی دھن میں
صبح، شبنم کے ساتھ رولیں گے

جان و دل کا اگر سوال اٹھا
اپنا دامن لہو سے دھو لیں گے

تو اگر زندگی ہے جانِ جہاں
زندگی کا بھرم نہ کھولیں گے

راہ ہموار ہو گئی تو جمیلؔ
اپنے بیگانے ساتھ ہولیں گے

○

تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہوگی
اک روز انہیں میری ضرورت بھی تو ہوگی

اک بار تو آئیں گے وہ کھولے ہوئے گیسو
اک روز قیامت کی مہورت بھی تو ہوگی

یہ غنچۂ نورس، یہ پر اسرار تبسم
اس میں ترے ہونٹوں کی حلاوت بھی تو ہوگی

کچھ مصلحت آمیز بھی تھی تیری محبت
کچھ دہر کے سینے میں کدورت بھی تو ہوگی

بازارِ زمانہ ہے، یہاں کیا نہیں ملتا
مانگو تو سہی جنسِ محبت بھی تو ہوگی

تنہا تو نہ جاؤں گا سرِ محفلِ یزداں
پہلو میں ترے درد کی دولت بھی تو ہوگی

○

جانے کیا بات تری زلفِ گرہ گیر میں ہے
جس کو سودا ہے وہی خانۂ زنجیر میں ہے

اس کی توقیر کسی گیسوئے خمدار سے پوچھ
یہ جو اخلاص کی خوشبو مری تقصیر میں ہے

اپنے ترکش سے ذرا پوچھ تو لے عشوہ طراز
وہی جینے کی خلش آج بھی نخچیر میں ہے

اُس کی قیمت دل و جاں سے بھی ادا کیا ہو گی
وہ شکایت کہ تری شوخیٔ تحریر میں ہے

کس بھروسے پہ یہ بنیاد جہاں رکھتے ہو
رنگِ تخریب اگر صورتِ تعمیر میں ہے؟

کوئی عقدہ ہی بتاؤ کہ اسے سلجھائیں
ایک نادیدہ خلش ناخنِ تدبیر میں ہے

○

کیسے کیسے طوفاں سر سے گزرے ہم خاموش رہے
دنیا میں رہ کر بھی سب کی نظروں سے روپوش رہے

کِس امید پہ ہم نے کاٹیں جاگتی راتیں، جلتے دن
کس کو اپنے دل میں بسایا، کس کے لئے مدہوش رہے

چاند کی مورت خواب کی صورت آنکھوں میں لہراتی رہی
اپنا ہی پیکر تھا جس سے برسوں ہم آغوش رہے

آئے ہو تو یہیں رہ جاؤ وقت کو میں ٹھہرالوں گا
سانسوں میں مہکار رہی ہو، زلف یونہی بردوش رہے

صبح ہوئی اور جاگنے والے کتنی منزل مار گئے
رات گئے تک نیند کے ماتے کیوں اتنے بیہوش رہے

عشق کے تانے بانے میں دل کو الجھائے رکھتے ہیں
دُنیا کے جلوت خانے میں ہم بھی خلعت پوش رہے

○

ہوائے جاں مرے کوچے سے تو گزر تو سہی
بکھر چکا ہوں مجھے اب تلاش کر تو سہی

میں لے اڑوں گا تجھے عنبریں فضاؤں میں
تو فرشِ خواب پہ چپکے سے پاؤں دھر تو سہی

یہ بات چھوڑ، مجھے تابِ دید ہو کہ نہ ہو
تو آئینے میں اتر تو سہی، سنور تو سہی

سنائی دے گی تجھے بھی زمین کی دھڑکن
فرازِ بام سے صاحب نظر! اتر تو سہی

قدم قدم پہ پکارے گی زندگی تجھ کو
تو لو لگا تو سہی، ایک بار مر تو سہی

بہت سنی ہیں بقائے دوام کی باتیں
جمیل آج ذرا جان سے گزر تو سہی

○

ہے تو اک نامِ خدا ہے گھر میں
اور کیا اِس کے سوا ہے گھر میں

جان جلتی ہے یہاں شام و سحر
کوئی مشعل نہ دیا ہے گھر میں

چار سو، گہرا، گھنا سناٹا
دل کی مدھم سی صدا ہے گھر میں

درو دیوار کو ہم کیا روئیں
دل کا بھی خون ہوا ہے گھر میں

صورتیں ہو گئیں سب خواب و خیال
اب نہ غمزہ نہ ادا ہے گھر میں

پھر نہ ابھرا کوئی سورج، کوئی چاند
جسم ایک ایک بجھا ہے گھر میں

در پہ حیران کھڑا ہوں کب سے
جو بھی کچھ تھا، وہ لٹا ہے گھر میں

یاد باقی ہے تو اے محرمِ جاں
آج بھی بوئے وفا ہے گھر میں

گھر سے باہر ہے وہ محبوب نظر
دل جسے ڈھونڈھ رہا ہے گھر میں

○

بہار آ کے چلی بھی گئی ہے گلشن سے
مگر فضاؤں میں اب تک مہک سی باقی ہے

○

جو تری بزم سے آئے وہ شرمسار آئے
ہمیں تھے جو تری زلفوں کے خم سنوار آئے

زمانہ ہم کو کہے بے وفا تو مان بھی لیں
جو تو کہے تو ہمیں کیسے اعتبار آئے

کبھی چمن میں صدا دی کبھی بیاباں میں
ملا نہ تُو تو تجھے منزلوں پکار آئے

کبھی تو زلف کی خوشبو چمن چمن پھیلے
کبھی تو لے کے تجھے مژدۂ بہار آئے

نظر نظر میں تمنا مچل مچل جائے
اگر تو آئے تو کیا کیا نہ تجھ پہ پیار آئے

تجھے جہاں سے چھپالیں مگر کہاں جائیں
اگر زباں پہ ترا نام بار بار آئے

ہے زندگی کا اجالا یہ بیقراریٔ جاں
یہ مہر و ماہ کہاں ہوں اگر قرار آئے

سنبھال کر اسے رکھو ہر اک بلا سے جمیلؔ
دل آئینہ ہے نہ اس پر کہیں غبار آئے

○

زندگانی کی حقیقت کو فسانہ تو ملا
زندہ رہنے کے لئے کوئی بہانہ تو ملا

دور تھی منزلِ مقصود مگر کیا کم ہے
راہ میں قافلۂ شوق روانہ تو ملا

ہم سے پہلے تھا کہاں تیر و کماں کا منظر
کرو اب مشقِ ستم تم کو نشانہ تو ملا

گو نہیں تھا ترے سینے میں دھڑکتا ہوا دل
تیری آنکھوں میں مگر رنگِ زمانہ تو ملا

دل بھی تنہا تھا خدائی میں خدا کی صورت
ہم کو اپنا سا یہاں کوئی یگانہ تو ملا

اپنے گلشن میں رہے بے سر و ساماں بلبل
کنجِ زنداں ہی سہی ہم کو ٹھکانہ تو ملا

○

تیرا غم تیری آرزو تے وصال
چاندنی میں سلگ رہے ہیں خیال

پیچ در پیچ سلسلے دل کے
مجھ کو تیرا، تجھے کسی کا خیال

تو نہیں تیری یاد بھی کیوں ہو
اب یہ کانٹا بھی مرے دل سے نکال

میں جہاں، دو جہاں کو بھول گیا
تو وہاں بھی رہا ہے شاملِ حال

عشق میرا ترے خلوص کا چاند
حسن تیرا مری نظر کا جمال

دل مرا شورشوں کا گہوارہ
جاں تری ادھ کھلی کلی کی مثال

یوں قیامت نہ بن سنبھل کے گزر
تھم نہ جائے یہ گردشِ مہ و سال

پھول میں نور، چاند میں خوشبو
کوئی دیکھے مرا جلال و جمال

خود کہاں صاحبِ کمال تھے ہم
ہم نے دیکھا ہے آرزو کا کمال

○

کب تک کریں فریبِ مسلسل پہ اعتبار
کب تک تحمیلِ وعدۂ فردا پہ جائیں ہم

○

ہم تو مرتے رہے بقا کیلئے
لوگ جیتے ہیں کیوں قضا کیلئے

اپنا ہونا بھی کیا قیامت ہے
دردِ سر ہی رہے خدا کیلئے

شاخِ دل بے ثمر رہی برسوں
نو شگفتہ سی اک ادا کیلئے

دل نے کیا کیا نہ پیرہن بدلے
ایک چھوٹی سی التجا کیلئے

شاہزادوں کی جھولیاں بھر دیں
کچھ رہا بھی ہے اس گدا کیلئے

کس نے کی تھی تری زباں بندی
ہم تو چپ تھے تری رضا کیلئے

دل ہے کم سن، بھٹک بھی جاتا ہے
روح بھی چاہیئے وفا کیلئے

سر پٹختی ہے شاخ شاخ کیساتھ
نیند کانٹے ہیں اب صبا کیلئے

برق ہے آندھیاں ہیں طوفاں ہیں
اپنی عمرِ گریز پا کیلئے

عمر کھوئی جمیل کیوں ہم نے
نگہہِ زود آشنا کیلئے

O

آدمی چاند تک پہنچ بھی چکا
میں جمیل اور کن خیالوں میں

○

آپ مجرم ہیں مگر ہم کو سزا دیتے ہیں
جب کہیں ملتے ہیں، آئینہ دکھا دیتے ہیں

جتنے کانٹے ہیں وہ راہوں میں بچھا دیتے ہیں
اور کیا اس کے سوا راہنما دیتے ہیں

ہم تو صدیوں سے انہیں پوجتے آئے ہیں مگر
یہ زر و سیم کے پیکر ہمیں کیا دیتے ہیں

اپنا معیارِ طلب اس کے سوا اور نہیں
وہ سنیں یا نہ سنیں ہم تو صدا دیتے ہیں

چاند میں جب تری تصویر نظر آتی ہے
داستانِ شبِ غم اور بڑھا دیتے ہیں

دردمندوں کے سخن میں ہے بلا کی تاثیر
آپ بھی روتے ہیں ہم کو بھی رلا دیتے ہیں

زرد پتوں کو نہ پاؤں سے کچل کر گزرو
مٹنے والے ہمیں پیغامِ بقا دیتے ہیں

جن کے نغموں کی کوئی لے نہ کوئی دھن ہے جمیل
مری آواز میں آواز ملا دیتے ہیں

○

تمہارے دل میں مرے دل کی آگ جلتی ہے
یہ شمع وہ ہے جو آٹھوں پہر پگھلتی ہے

مرے خیال کے روزن سے تم نے یوں جھانکا
کہ جیسے چاند نکلتا ہے، شام ڈھلتی ہے

نگار خانۂ دل میں ترے جمال کی ضو
برنگِ نورِ سحر رات بھر مچلتی ہے

کسے خبر کہ یہی ہے متاعِ دیدہ و دل
یہ گمرہی جو مرے ساتھ ساتھ چلتی ہے

ستم تو دیکھ کہ جلتا ہے جب بھی پروانہ
چراغِ بزم کی لو اور بھی مچلتی ہے

مری نگاہ کی چلمن سے آ کے دیکھ ذرا
حیات روز نیا پیرہن بدلتی ہے

اِسے فریبِ مسلسل سے لاکھ بہلائیں
یہ آرزو ہے سنبھالے کہاں سنبھلتی ہے

نگاہِ حسن میں سو بار ڈوب کر ابھرے
جمیلؔ ناؤ بھنور سے بھی بچ نکلتی ہے

○

منزل پہ جا کے بھی نہ ہمیں روشنی مِلی
جلتے رہے چراغ مگر تیرگی مِلی

تم میرِ کارواں تھے کہو تم کو کیا ملا
ہم کو تو خیر خاک بسر گمرہی مِلی

دامن ہے چاک چاک، گریباں ہے تار تار
مانگا تجھے تو ہم کو یہ دیوانگی مِلی

تیری جفا کے بعد کہیں کے نہ ہم رہے
رُخ جس طرف کیا ہے تری بے رخی مِلی

اپنے ہوئے نہ اپنا کسی کو بنا سکے
یہ زندگی مِلی بھی تو کس کام کی مِلی

دل میں جنوں کی آگ، نہ آنکھوں میں خوں کا رنگ
اُن کو بھی کیا مِلا ہے جنہیں خواجگی مِلی

دیکھا ہمیں تو آنکھ بچا کر نکل گئی
کل سوئے اتفاق ہمیں زندگی مِلی

آج اپنے آپ سے جو نگاہیں ملیں جمیل
آنکھوں سے جھانکتی ہوئی شرمندگی مِلی

○

(نذرِ مصطفیٰ زیدی)

موت جب بھی کسی فنکار کو آجاتی ہے
اُس کی دھڑکن دلِ یزداں میں سما جاتی ہے

موت اک وقفۂ واماندگیٔ شوق سہی
تاابد دل کے دھڑکنے کی صدا جاتی ہے

سو بھی جاتا ہوں اگر حشر چھپا کر دل میں
صبح کی پہلی کرن آگ لگا جاتی ہے

لے کے چلتی ہے مری خاک کو یوں بادِ صبا
کوچۂ یار میں گلزار کھِلا جاتی ہے

یہ ترے ہاتھ کہ ہیں مرے لہو سے رنگیں
اڑ کے تا لالہ و گل اِن کی حنا جاتی ہے

مختصر ہی سہی یہ صحبتِ ہستی لیکن
یاد یاروں کی مری عمر بڑھا جاتی ہے

رقص کرتے ہیں ستارے سے رگ و پے میں جمیل
رات چپ چاپ مرے دل میں سما جاتی ہے

○

وہ بھی ہیں دشمنِ دل وجاں یہ خبر نہ تھی
جن سے جمیل ہم نے کبھی بات بھی نہ کی

ان تشنہ کامیوں پہ یہ حد صبر وضبط کی
ساقی نے ہم سے حسرتِ صہبا بھی چھین لی

خوش فہم اس قدر ہیں کہ دورِ خزاں میں بھی
چھیڑی ہے ہم نے راگنی فصلِ بہار کی

تنہائیوں میں کوئی سخن آشنا تو ہو
گر تو نہیں تو یہ در و دیوار ہی سہی

اب اور کوئی فتنۂ محشر اٹھا کے دیکھ
دو دن میں ہم نے یہ تِری دنیا تو دیکھ لی

○

گھر تری یاد سے آباد بھی کر لیتے ہیں
کچھ خیالِ دلِ برباد بھی کر لیتے ہیں

یوں تو روٹھے ہوئے اک عمر ہوئی ہے ان کو
جی میں آئے تو کبھی یاد بھی کر لیتے ہیں

مقصدِ زیست اگرچہ ہنسیں گریاں ہونا
دل بھر آتا ہے تو فریاد بھی کر لیتے ہیں

التفات اُن کا یہ کیا کم ہے کہ جب جی چاہے
اپنے دیوانوں پہ بیداد بھی کر لیتے ہیں

اپنی بے لوث ریاضت کی یہ حد ہے کہ جمیلؔ
جان کو جسم سے آزاد بھی کر لیتے ہیں

○

کہیں نغمے بکھرتے ہیں کہیں گیسو سنورتے ہیں
مگر ہم ہیں کہ اجڑی ساعتوں کو یاد کرتے ہیں

کوئی زہراب ہے یارو کہ امرت سے بھی میٹھا ہے
یہ کس انداز سے وہ میری نس نس میں اترتے ہیں

انہیں کو موت آتی ہے جنہیں جینا نہیں آتا
وہ جن کے دل سلامت ہیں کہیں وہ لوگ مرتے ہیں

ہوئی مدت جمیلؔ اُجڑا تھا اپنا آشیاں لیکن
ہم اپنی خانہ ویرانی کو اب تک یاد کرتے ہیں

○

جان واریں، کہ دل نثار کریں
کچھ تو تعظیمِ نو بہار کریں

اُن کی گردن میں ڈال دیں باہیں
وہ تقاضا تو ایک بار کریں

جن سے ملتا ہے زندگی کا سراغ
کیوں نہ اُن لغزشوں سے پیار کریں

اب کے موسم کچھ اور کہتا ہے
اب کے کانٹوں سے دل فگار کریں

چھیڑ کر اپنی داستانِ وفا
کیا جمیلؔ اُن کو شرمسار کریں

○

جتنا تڑپے گی، ہمیں اور بھی تڑپائے گی
وقت کی موج ہے سر سے بھی گزر جائے گی

شام سے تا بہ سحر راہ تو دیکھوں گا تیری
جاں سمٹ کر مری آنکھوں میں چلی آئے گی

تجھ کو معلوم بھی ہے، عشق کی ایذا طلبی
تجھ کو دیکھے گی تو کترا کے نکل جائے گی

آشیانوں میں سمٹنے سے نہ تھمے گا طوفاں!
ابر چھایا ہے تو پھر برق بھی لہرائے گی

کبھی دیکھیں بھی تو اس شوخ کو سرمستِ خرام
یوں تو ہم نے بھی سنا ہے کہ بہار آئے گی

○

وہ ترا پیار اک فسانہ ہوا
تجھ سے بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا

میں یہاں راستوں میں خاک بسر
تو کہاں، کس طرف روانہ ہوا

دل نے رو رو کے منتیں مانگیں
تو مگر دل کا آسرا نہ ہوا

وقت کے ساتھ سب بدلتے ہیں
تیرا غم بھی، غمِ زمانہ ہوا

اُس نے طوفاں سے کھیلنا سیکھا
جس کی کشتی کا ناخدا نہ ہوا

اُس طرف چل دیا زمانہ بھی
جس طرف آدمی روانہ ہوا

جان بھی، دل بھی نذر کر بیٹھے
زندگانی کا حق ادا نہ ہوا

○

قریب و دور سے آنے لگیں صدائیں مجھے
بلا رہی ہیں ترے شہر کی ہوائیں مجھے

ہزار بار منایا انہیں کبھی یوں ہو
میں روٹھ جاؤں تو وہ پیار سے منائیں مجھے

انہیں کا سود و زیاں ہے یہ جاں رہے نہ رہے
ھزار بار محبت میں آزمائیں مجھے

کچھ اس طرح تری راہوں میں دل ہوا پامال
مرا رقیب بھی دیتا رہا دعائیں مجھے

مرے جنوں سے ملے گا خود آگہی کا سراغ
خرد کے نام پہ وہ راہ پر نہ لائیں مجھے

ٹھہر گیا ہوں مگر سنگِ میل کی صورت
مسافروں سے کہو رہنما بنائیں مجھے

مَیں کوہ و دشت و بیاباں میں نغمہ ریز رہا
جمیلؔ ڈس گئی شہروں کی سائیں سائیں مجھے

○

نظر نظر میں اجالا، پلک پلک تارے
شکست کھا کے بھی ہم حوصلہ نہیں ہارے

مرا تو کیا ہے کہ میں ہوں چراغِ کشتۂ شب
تو ماہتاب ہے تو اپنی فکر کر پیارے

زمانہ دن کے اجالے میں ان کو بھول گیا
اس ایک بات پہ روئے ہیں رات بھر تارے

خرد کا کھیل کبھی ہار ہار کر جیتے
کبھی یہ بازیِٔ دل جیت جیت کر ہارے

متاعِ دیدہ و دل اب وہاں نہیں ملتی
چلے تھے چھوڑ کے جن بستیوں کو بنجارے

یہی خلوص و کرم ہے، یہی وجود و عدم
یہاں بھی خون کے چھینٹے وہاں بھی انگارے

○

خانۂ جاں، چراغ جیسا ہے
دل بھی اپنا دماغ جیسا ہے

چھلکی پڑتی ہے اِس سے وقت کی مے
آسماں بھی ایاغ جیسا ہے

ایک دن تم بھی سیر کو نکلو
دل کا ہر زخم باغ جیسا ہے

یہ بھی اِک شہرِ درد ہے دیکھو
چاند بھی دل کے داغ جیسا ہے

تیری چاہت کا نا تمام سفر
جنگلوں کے سراغ جیسا ہے

سینۂ ماہ میں بھی کیا ہوگا
اپنے ماتھے پہ داغ جیسا ہے

○

کب مجھے دار پہ کھینچا نہ گیا
سر سے لیکن ترا سودا نہ گیا

ساتھ اک عمر کی رسوائی تھی
مَیں ترے شہر میں تنہا نہ گیا

دل میں ارمان تجھے جانے کیا کیا
تم سے تو حال بھی پوچھا نہ گیا

اُس سے برسوں کی شناسائی تھی
آنکھ اٹھا کر جسے دیکھا نہ گیا

دھوپ چھاؤں میں کٹی عمر تمام
مرا رونا، ترا ہنسنا نہ گیا

میں نے ہر رنگ میں دیکھا تجھ کو
مجھ سے لیکن ترا پردا نہ گیا

اُٹھ گئے سب تری محفل سے مگر
اک ترا چاہنے والا نہ گیا

عکس تیرا مرے سینے میں رہا
آئینے سے ترا چہرا نہ گیا

وہی یوسف ہے سرِ بزمِ خیال
آج تک خوابِ زلیخا نہ گیا

چاند سورج بھی گہن میں آئے
دل کی آنکھوں سے اجالا نہ گیا

کائنات ایک ہے اور ذات بھی ایک
تجھ سے باہر مرا سایا نہ گیا

○

زندگی کی داستاں حسنِ بیاں تک آ گئی
تیری انشاں سے چلی تھی کہکشاں تک آ گئی

محفلِ اغیار میں ہیں میری چُپ کے تذکرے
میں کہاں اور میری خاموشی کہاں تک آ گئی

کیا تجھے کافی نہ تھا آغوشِ فطرت کا سکوں
اے مری آوارگی، تو کس جہاں تک آ گئی

عقل گو مائل نہ تھی لیکن نہ جانے کیا ہوا
روح جھک کر تیرے سنگِ آستاں تک آ گئی

فاصلے باقی نہ اب صحرا و دریا میں رہے
موجِ طوفاں یوں اُٹھی ریگِ رواں تک آ گئی

تذکرہ تھا زندگی کی پائیداری کا جمیلؔ
چلتے چلتے بات مرگِ ناگہاں تک آ گئی

○

جو دیکھئے تو ہمیں زندگی نے کیا نہ دیا
بس ایک خاطرِ تنہا کو آسرا نہ دیا

یہ رختِ جاں کہ ازل سے اٹھائے پھرتے ہو
اگر گراں ہے تو کیوں راہ میں لٹا نہ دیا

ہر ایک بولتی صورت کو غور سے دیکھا
مگر کسی نے ترے شہر کا پتہ نہ دیا

جہانِ شوق میں ہم سر بلند ہو جاتے
غضب کیا کہ ہمیں بزم سے اٹھا نہ دیا

نگاہِ حسن کے ترکش سے کتنے تیر چلے
کوئی بھی زخم مگر زخمِ عشق سا نہ دیا

ہنسی ہنسی میں ستم گر نے جان بھی لے لی
صلہ وفا کا دیا یوں کہ خوں بہا نہ دیا

○

کوئی نہ آیا، کوئی نہ آیا، نینن دیپ جلے
بیٹھا رہا انجان مسافر دھیان کی چھاؤں تلے

تم بھی راس رچا لیتی ہو مور کھ من کے سنگ
دل کا دیپ جلا لیتا ہوں مَیں بھی شام ڈھلے

میں تو اس بھگوان کی پوجا کرتا ہوں دن رین
جس کا سر آکاش سے اونچا دھرتی پاؤں تلے

پیار کی خوشبو من میں بسا کر گیانی امر ہوئے
روپ انوپ کی دنیا سے سب ناطے توڑ چلے

مٹی میں ہیرے رِل جائیں بیری قدر نہ جانیں
نگر نگر میں خاک اڑے تو دُنیا ہاتھ مَلے

○

اڈی گھٹائیں یوں کہ رگ جاں کو ڈس گئیں
آیا ترا خیال تو آنکھیں برس گئیں

اُن کے لئے بھی کوئی ادائے شگفتگی!
جو حسرتیں خزاں کی نگاہوں میں بس گئیں

کوئی خدا بھی اُن کی تلافی نہ کر سکا
جن چاہتوں کو تیری دعائیں بھی ڈس گئیں

جن خواہشوں کو وسعتِ عالم بھی تنگ تھی
وہ خواہشیں سمٹ کے مرے دل میں بس گئیں

گلشن میں جس طرف بھی گیا حسنِ خوش خرام
شادابیاں بزنگِ صبا پیش و پس گئیں

پھولوں سے کل نسیم نے کیا زیرِ لب کہا
سرگوشیاں سی اڑ کے چمن تا قفس گئیں

○

پیار میرا کسی صورت کا پرستار نہ تھا
میں گنہگار سہی، عشق گنہگار نہ تھا

کیا ہوئی جانِ حیا وہ تری تسلیم کی خو
تیرے اقرار میں شامل کبھی انکار نہ تھا

دل کو ہونا تھا اُسی شوخ کی خاطر رسوا
جو سبھی کا تھا، مگر اپنا طرفدار نہ تھا

یا چلے آئے ہیں وہ حسرت دیدار لئے
یا انہیں میری محبت سے سروکار نہ تھا

یاد ہے ہجر کے صحرا کی کڑی دھوپ ہمیں
دور تا حدِ نظر سایۂ دیوار نہ تھا

کب نہ جینے کی تمنا میں گرفتار تھے ہم
کب جنوں جرمِ صداقت میں سرِ دار نہ تھا

جذبہ سینے میں ڈھلا ہونٹ ہلے پھول کھلے
دل سا یارو کوئی پیمانۂ اظہار نہ تھا

( )

جنوں میں کیا نہ کہا بے خودی میں کیا نہ کہا
مگر یہ بات کہ تجھ کو کبھی خدا نہ کہا

یہ جانتے تھے کہ اک اک رقیب ہے اپنا
ملے سبھی سے مگر تجھ کو بے وفا نہ کہا

اِدھر اُدھر کے فسانے سنا کے لوٹ آئے
ستم تو دیکھو کہ اک حرفِ مدعا نہ کہا

کوئی کلی نہ چمن میں چٹک کے پھول بنی،
غلط ہی کیا ہے صبا کو اگر صبا نہ کہا

شعور ہی سے کھلے عقدہ ہائے بست و کشاد
مگر حقیقتِ دل کو بھی نارسا نہ کہا

شکستِ شیشۂ دل روحِ نغمۂ جاوید
شکستِ شیشۂ دل کو تری صدا نہ کہا

کہیں رکا نہ تھما، صبح و شام چلتا رہا
کبھی جمیل کو ہم نے شکستہ پا نہ کہا

○

جو ہم نہ ہوں، تو ترا اعتبار کون کرے
نگارِ بزمِ سُخن، تجھ سے پیار کون کرے

فراق میں بھی ہے اک لذتِ وصالِ دوام
مگر یہ طرفہ ستم اختیار کون کرے

جو مانگنے کے لئے جائیں بھیک بھی نہ ملے
وفا کی بات سرِ کوئے یار کون کرے

ہم آج اپنے کئے پر ہیں آپ شرمندہ
نگاہِ دوست تجھے شرمسار کون کرے

اگر ہو رات تو آنکھوں میں کاٹ لیں ہم لوگ
سحر سے تا بہ سحر انتظار کون کرے

بہار ہو تو نظر آئیں رنگ رنگ کے پھول
خزاں کے دل میں تلاشِ بہار کون کرے

وہ بے نیاز سہی، سرفراز ہیں ہم بھی
جمیل عرضِ طلب بار بار کون کرے

○

بازارِ زمانہ ہو کہ فردوس کا در ہو
اُس راہ سے گزریں جو تری راہگزر ہو

یہ پردۂ تخیل پہ جلووں کا تلاطم
جیسے پسِ احساس کوئی شعبدہ گر ہو

سو رنگ میں دل پہ تری تصویر ابھاروں
کچھ اتنا مصور مرا ہر تارِ نظر ہو

ہوتی ہے انہیں عشرتِ محفل کی لگن بھی
وہ لوگ جنہیں کوئے ملامت کی خبر ہو

یہ کیا کہ وہی کشمکشِ سود و زیاں ہے
اے گردشِ دوراں کوئی اندازِ دگر ہو

بے فیض اجالوں سے ضیا مانگنے والو
تم حسنِ جہانتاب ہو، خورشید و قمر ہو

پیغام سحر آئے ستاروں کی زباں سے
یوں تو مری فریاد نہ محرومِ اثر ہو

○

دنیا سے نہ آپ سے گِلا ہے
کھوئے ہیں تو راستہ مِلا ہے

صدیوں کا اگرچہ فاصلا ہے
تو میرے جلو میں چل رہا ہے

انساں کا لہو پکارتا ہے
قاتل کا سراغ مل چکا ہے

کچھ پیار مرا ہے شبنم آسا
کچھ دل بھی ترا گلاب سا ہے

اس دل میں بسا ہے شہرِ آذر
یہ دل ہی مقامِ کبریا ہے

ھر لحظہ روا روی کا عالم
دنیا بھی عجیب سلسلہ ہے

جھانکو تو ذرا جمیل اس میں
آئینۂ دل جہاں نما ہے

○

دولتِ کائنات ملتی ہے
وہ ملیں تو حیات ملتی ہے

طور دل کے ہَیں ایک سے ورنہ
رنگ اُن سے، نہ ذات ملتی ہے

مسکراہٹ پہ مرنے والوں کو
مسکرا کر حیات ملتی ہے

پیار تنہا کبھی نہیں ملتا
بیقراری بھی سات ملتی ہے

قصۂ جبر و اختیار نہ چھیڑ
مانگتے دن ہیں، رات ملتی ہے

زندگی ہم سے آشنا ہے مگر
کس تکلف کے سات ملتی ہَے

جلوۂ حسنِ نو بنو سے جمیل
دل کی بھی بات بات ملتی ہے

○

قیس پھر گرمِ سفر جانبِ صحرا تو نہیں
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ لیلیٰ تو نہیں

وہی لپکے ہوئے عارض، وہی مہکے ہوئے ہونٹ
سچ بتا کون ہے تو میری تمنا تو نہیں

تیری نظروں کا تکلم، تری باہوں کا گداز
اک سہارا ہی سہی، غم کا مداوا تو نہیں

جو ہوس کار ہیں، وہ اپنی نظر پہچانیں
میری نظروں میں بھروسہ ہے تقاضا تو نہیں

شہر کو چھوڑ کے کیوں دشت و دمن میں بھٹکیں
حسنِ محبوب! ہمیں عشق ہے سودا تو نہیں

کوئی جلوہ ہے کہ رہ رہ کے جھلک جاتا ہے
رنگِ امروز میں پنہاں رخِ فردا تو نہیں

کس لئے لوگ کنارے سے لگے بیٹھے ہیں
زندگی سیل ہے، طوفاں ہے، تماشا تو نہیں

○

چشم بے نور کو آئینۂ حیراں نہ کہو
سنگِ مرمر کا یہ بت ہے اسے انساں نہ کہو

اک نہ اک یاد سے رہتا ہے یہ قریہ روشن
دل کی وادی کو کبھی خانۂ ویراں نہ کہو

پاس آکر بھی تو رہتا ہے بہت دور اُسے
دور ہے جو اُسے نزدیکِ رگِ جاں نہ کہو

دوستو عشق کی تفسیر نہ ہو پائے گی
غمِ جاناں کو بھی جبتک غمِ دوراں نہ کہو

جو نگاہوں کو نہ زخمائے وہ عشوہ کیا ہے
جو کسی دل میں نہ ٹوٹے اُسے پیکاں نہ کہو

اوس کی طرح پگھلتی ہے جوانی کی بہار
گرم ہے خوں تو اِسے سرخیٔ جاناں نہ کہو

ہار کر پیار میں یوں موت کو آواز نہ دو
سخت دشوار ہے مرنا اِسے آساں نہ کہو

مُنہ چھپاتا ہوا سورج تو ہے مونس اپنا
ایسی تنہائی کو تم شامِ غریباں نہ کہو

جسم اور روح کے سنگم پہ اترتی ہے بہار
جسم گلشن ہے اِسے روح کا زنداں نہ کہو

کیا عجب ایک اشارے سے اٹھا دیں طوفاں
جو نظر آتے ہیں ناداں، انہیں ناداں نہ کہو

جسم سے پھول برستے ہیں شراروں کی طرح
کیوں جمیلؔ اب بھی اِسے سروِ چراغاں نہ کہو

○

ضمیرِ عشق میں کیا کیا نہ انقلاب ہوئے
کبھی جو ہم تری محفل میں باریاب ہوئے

نگاہ جب نہ ملی تھی، سوال تھے ہم لوگ
نگاہ تو نے اٹھائی تو لاجواب ہوئے

ستم بھی دستِ ستمگر کے ہم نہیں بھولے
کرم بھی ہم پہ ہوئے جب تو بے حساب ہوئے

تو جا کے بیٹھ گیا جانے کس خرابے میں
تری تلاش میں ہم کو بکو خراب ہوئے

جنہیں تھا زعمِ وفا جیت کر بھی ہار گئے
جو کامیاب نہیں تھے وہ کامیاب ہوئے

گرے تو ایسے گرے ہم نگاہِ گلچیں سے
بھری بہار میں آپ اپنا انتخاب ہوئے

تلاشِ حسن میں جو بھی افق کے پار گئے
وہ شب کو چاند بنے، دن کو آفتاب ہوئے

( )

ذہن کا بارِ گراں سر پہ اٹھا رکھا ہے
کتنی صدیوں کو نگاہوں میں بسا رکھا ہے

یہ بھی اک ظلم ہے جو ہم نے روا رکھا ہے
اپنے ہونٹوں کو تبسم سے سجا رکھا ہے

تیری آواز کے گھنگھرو مرے دل کی چھم چھم
جیسے دونوں نے کوئی ساز اٹھا رکھا ہے

تو نہیں ہے نہ سہی جشن کا انداز تو ہے
گھر کے ہر طاق پہ اک داغ جلا رکھا ہے

مجھ کو دیکھو مرے اندازِ نظر کو دیکھو
کاخ و ایواں کے در و بام میں کیا رکھا ہے

کوئی شیریں تو ہے پرویز کے پہلو میں جمیل
جس نے اس دور کو فرہاد بنا رکھا ہے

○

آیا ہے پہن کر کوئی سونے کا لبادہ
انساں مجھے محبوب ہے سونے سے زیادہ

کیا خوف مجھے شورِ خطیبانِ حرم سے
مَیں بندۂ درویش مری بات ہے سادہ

ہے طرفہ تماشا کہ بھلا بھی نہیں سکتا
جس نام سے وحشت مجھے ہوتی ہے زیادہ

اپنی تھی مگر ہو بھی چکی بات پرانی
کاہے کو اسی بات کا کرتے ہو اعادہ

جینے کی تمنا میں گئی جاں بھی ہماری
اب موت کے سائے میں ہے جینے کا ارادہ

حاصل ہے وہی چیز کہ جو پاس نہیں ہے
اک عالمِ صد کیف ہے بے منتِ بادہ

ویرانے کا سودا کہ صنم خانے کی دھن ہے
بولو تو جمیلؔ آج کہاں کا ہے ارادہ

○

ایک ایک کر کے پھول چمن کے بکھر گئے
آئے تھے دن بہار کے، تنہا گزر گئے

میں تھا، تمہارا نام تھا اور دشتِ آرزو
دو چار گام تک تو مرے ہمسفر گئے

دشتِ جنوں میں ان کو پکارا کہاں کہاں
اے دوست تیرے ساتھ جو لمحے گزر گئے

چُپ تھے کہ جانتے تھے دلوں کی حکایتیں
دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم بے خبر گئے

آواز بن کے گونج اٹھی دل کی خامشی
صحرا کو چھوڑ کر جو کبھی اپنے گھر گئے

دل ہی رہا، نہ جاں ہی بچی اُن کے روبرو
ہم دیکھنے میں یوں تو سلامت گزر گئے

میرے خیال و خواب کی رنگینیاں نہ پوچھ
میرے خیال و خواب سے عالم سنور گئے

○

کچھ عجب کار گاہِ ہستی ہے
زیست مہنگی ہے موت سستی ہے
ہوش والے بھی ہوش کھو بیٹھے
مے پرستی کہ فاقہ مستی ہے
تھا جہاں شبنم و صبا کا خرام
اب وہاں تشنگی برستی ہے
لحظہ لحظہ فزوں ہے تنہائی
ہر بُنِ مُو کو رات ڈستی ہے
تیری افشاں نہ چاند کا جھومر
رات ہے یا اجاڑ بستی ہے
چند روزہ اور بارِ جبر سہی
اور کچھ دیر زخم پستی ہے

ہم گنہگار اب کہاں جائیں
عدل والوں کی سرپرستی ہے

○

پربت سے جو چشمہ پھوٹے، دھرتی اور بہے
ہونی کا کیا رونا یارو، ہونی ہو کے رہے
لاکھ پتنگے جان سے جائیں، دیپک ایک جلے
دیکھتی آنکھیں سب کچھ دیکھیں، منہ سے کون کہے
وہ سمجھیں اور کوئی نہ جانے بھید بھاؤ کی بات
جو کہنا ہو ہم کہہ آئیں، دل کی ساکھ رہے
رستہ تکتے تکتے ٹوٹی یوں ہردے کی آس
جیسے پچھلی رات کو جلتے جلتے دیپ بجھے
چاند نہیں تو اپنے من کی جوت جگاؤ
اک اک تارا ڈوب چکا ہے، دیپ سے دیپ جلے
دنیا رنگ بدلتی جائے، پل پل سوانگ رچائے
صحرا سے ساگر اٹھے، ساگر میں آگ لگے

مایا کا بازار ہے دنیا، لوبھ کا سب بیوپار
بے قدروں کی اس نگری میں دل کا نام نہ لے

○

دل فروزاں دماغ روشن ہیں
اپنے دم سے چراغ روشن ہیں

شاخچوں پر دہک رہے ہیں گلاب
آگ جلتی ہے، باغ روشن ہیں

روح کی پیاس بجھ سکی ہے کہیں
یوں تو کتنے ایاغ روشن ہیں

درد کا چاند، یاد کا سورج
کیسے کیسے چراغ روشن ہیں

بستی بستی میں جاگتے ہیں چراغ
یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

خون کی سرخیاں ہیں چہروں پہ
قاتلوں کے سراغ روشن ہیں

دل کا ہر زخم ضوفشاں ہے جمیلؔ
گھر کے سارے چراغ روشن ہیں

○

ہماری عمر بھی گزری ہے یہ خطا کرتے
نگارِ بزمِ سخن تجھ سے کیا گلا کرتے

تمہارے پیار کی قیمت ہماری جاں بھی نہ تھی
ہمارے پاس ہی کیا تھا کہ حق ادا کرتے

فسانۂ غمِ دل ختم ہی کہاں ہوتا
سنانے والے کہیں سے بھی ابتدا کرتے

تمہارے بعد ہم اپنی ادا بھی بھول گئے
وہ دل کہاں کہ کسی اور دل میں جا کرتے

وفا کی راہ میں ٹوٹے ہیں کتنے آئینے
ہم اپنے شیشۂ دل کو بچا کے کیا کرتے

سکون سے ہمیں مرنا نصیب ہو جاتا
جمیلؔ کاش ہم ایسی کوئی خطا کرتے

○

سوائے قلب و نظر کوئی رہنما بھی نہیں
وہ تیرگی ہے کہ شبنم کا اک دیا بھی نہیں

بہت دنوں سے چمن ہے اداس کیا کیجے
ادائے گل بھی نہیں، شوخیٔ صبا بھی نہیں

ہر ایک اپنی ہی دھن میں رواں ہے، جانے کہاں
کوئی کسی کی طرف مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

ہوئے ہیں قتل ہم اپنے خلوص کے ہاتھوں
تری خطا بھی نہیں ہے، مری خطا بھی نہیں

جو دیکھیے تو ہم اک آرزو مجسم ہیں
جو پوچھیے تو کوئی حرفِ مدعا بھی نہیں

ہماری روح بھی شاداب اپنا دل بھی غنی
بلا سے سر پہ اگر سایۂ ہما بھی نہیں

بکھر گیا ترے چہرے پہ روشنی بن کر
وہ حرفِ شوق کہ میں نے ابھی کہا بھی نہیں

وہ رات دن رگِ جاں سے قریب رہتا ہے
خدا جمیل وہی ہے جو نارسا بھی نہیں

مطمئن تھے، تو ستم یاد آئے
ہم کو کعبے میں صنم یاد آئے

غمِ دنیا کے ستم کیا کم تھے
اس پہ تیرے بھی کرم یاد آئے

چھو گیا تھا کوئی دامانِ خیال
کب کے بھولے ہوئے غم یاد آئے

زندگی نام ہے بیداری کا
کیوں ہمیں خوابِ عدم یاد آئے

ہم کو انساں کا چلن یاد رہا
اور انہیں دیر و حرم یاد آئے

لکھ دیا اپنے مقدر کا حساب
جب ہمیں لوح و قلم یاد آئے

○

آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ناکام حسرتو
اُس مہرباں کے پاس بھی کچھ روز جا بسو
کِھلتا ہوا گلاب ہوں رک جاؤ تھوڑی دیر
جاتی ہوئی بہار کے ناشاد قافلو
فرصت ملے تو بزمِ رقیباں کو چھوڑ کر
اپنے اسیرِ شوق کی حالت بھی دیکھ لو
حکمِ ازل یہی ہے کہ اک حسنِ ظن کے ساتھ
محبوبۂ جہاں کا چلن دیکھتے رہو
یوں سرخیاں ہیں اب کے برس شاخ شاخ پر
جیسے رگِ بہار میں خونِ بہار ہو
اپنے وطن میں اپنے مقدر پہ طنز ہوں
یارو دیارِ غیر میں مجھ کو نہ لے چلو

وہ سازِ نو بہار ہو یا نغمۂ جمیل
پہچانتے ہیں جذبۂ بے اختیار کو

○

تو اپنے درد نصیبوں کا حال کیا جانے
یہی بہت ہے کہ زندہ ہیں تیرے دیوانے

اب آنسوؤں کے جزیروں کا تذکرہ کیسا
کہا نہ تھا کہ چھلک جائیں گے یہ پیمانے

مری نوا نے انہیں کر دیا ابد کنار
زبانِ خلق پہ جتنے تھے تیرے افسانے

ہر ایک بزم میں شمعیں عبث ہوئیں رسوا
خود اپنی آگ میں جلتے رہے ہیں پروانے

زمانہ صرف نمائش پہ جان دیتا ہے
دلوں کا حال تو ہم جانے یا خدا جانے

صنم کدے تو بہت تم نے کر دیئے آباد
جو ہو سکے تو بساؤ دلوں کے ویرانے

جو سنگِ حال کو منزل سمجھ کے بیٹھ گئے
انہیں دیا نہ سہارا کسی بھی فردا نے

جمیلؔ کوئی ہمیں مطمئن ملا ہی نہیں
کسی کو عشق نے مارا، کسی کو دُنیا نے

○

ہمدم ہوئے، رفیق ہوئے، مہرباں ہوئے
دنیا میں ہم سے صاحبِ دل بھی کہاں ہوئے

جب چھیڑ دی کسی نے تری دلبری کی بات
یوں کھو گئے کہ ہم بھی تری داستاں ہوئے

جو قہقہے سنبھال کے رکھے تھے زیرِ لب
وہ قہقہے بھی نذرِ غمِ دوستاں ہوئے

جو بڑھ گئے لپٹ کے ملیں اُن سے منزلیں
جو رہ گئے وہ گردِ پسِ کارواں ہوئے

پیکار زندگی ابھی جاری ہے دوستو
جو کامراں تھے وہ بھی کہاں کامراں ہوئے

ہم زندگی کی عقدہ کشائی تو کر چکے
اب آپ زندگی کے لئے امتحاں ہوئے

سمٹے تو ایک گوشۂ دل میں سما گئے
پھیلے تو زندگی کی طرح بیکراں ہوئے

مارے گئے تو جان کی قیمت ہوئی وصول
جیتے رہے تو ایک جہاں کی زباں ہوئے

ڈھالے ہیں جسم نے چاند اجالے ہیں دو جہاں
یہ معجزے جمیل بتاؤ کہاں ہوئے

O

بزعمِ خود اِسے ہر چند سلجھاتے رہے برسوں
مگر پھر بھی ابھی تک زلفِ ہستی میں وہی خم ہے

○

سایہ سا مرے پاس سے لہرا کے گیا ہے
یہ تو ہے کہ یہ بھی تری گمنام ادا ہے

ارمان پتنگوں کی طرح ناچ رہے ہیں
یادوں کے شبستاں میں کوئی دیپ جلا ہے

جو ہے سو ترے حسن کی دیتا ہے گواہی
ہیں شہرِ محبت میں ترا ذکر چھڑا ہے

محفل میں حریفانِ نظارہ تو بہت تھے
کانٹا تری نظروں کا مرے دل میں چبھا ہے

اب درد بھی چمکے گا، مداوا بھی نہ ہو گا
نیشِ رگِ جاں کو تے ملامت کی ہوا ہے

کیا اُس کو مری آبلہ پائی کی خبر ہو
جس شوخ کے ہاتھوں پہ ابھی رنگِ حنا ہے

کانٹے بھی ہیں اُس راہ کے سرسبز و شگفتہ
جس راہ میں خود راہنما آبلہ پا ہے

کعبہ و کلیسا کے خدا کانپ رہے ہیں
اک حشر سرِ منبر و محراب بپا ہے

دامانِ جنوں چاک یہاں بھی ہے وہاں بھی
صحرا و گلستاں میں کہو فرق ہی کیا ہے

○

یہ موت ہے تو جمیل اور زندگی کیا ہے
ہر اک زباں پہ شہیدوں کے نام آتے ہیں

○

ہم جن کے لئے شکستہ پا ہیں
وہ لوگ تو صورت آشنا ہیں

کٹتا نہیں عمر سے ملامت
ہم کون سے جرم کی سزا ہیں

کس کس نے کیا ہے خون دل کا
کس کس کے کرم سے آشنا ہیں

ہے لفظ و بیاں کا فرق ورنہ
چشم ولب و زلف دلربا ہیں

دل تنگ ہیں غنچۂ دہن سے
یک رنگیٔ حسن سے خفا ہیں

دنیا ہے اگر قمار خانہ
سب لوگ ہیں بوالہوس تو کیا ہیں

مٹی سے وہ مورتیں تراشو
جو رنگ ہیں، نور ہیں، صدا ہیں

دُنیا سے کہو اِدھر سے گزرے
ہم نقشِ قدم ہیں، رہنما ہیں

○

بہت قریب سے بھی فاصلے نظر آئے
ذرا سی ٹھیس لگی کب کے زخم ابھر آئے

تری نگاہ کے کانٹوں نے پھر بھی الجھایا
سنبھل سنبھل کے چلے، سوچ سوچ کر آئے

اجڑنے والے سرِ رہگزار بیٹھے ہیں
عروسِ حسن سے کہہ دو، ذرا سنور آئے

اس آرزوئے طلب میں کہاں کہاں نہ گئے
کہیں خلوص ملے، کوئی دل نظر آئے

یہ کس نے چھیڑ دیا قصۂ فریبِ وفا
سہاگ رات کی آنکھوں میں اشک بھر آئے

ہزار منزلیں آئیں، گزر گئیں لیکن
جو ہمسفر تھے ہمارے نہ لوٹ کر آئے

جو کم عیار تھے وہ اپنی قدر کھو بیٹھے
دیارِ ناز میں اب کوئی معتبر آئے

نظر کے ہم بھی ہیں قائل مگر خدائے جمال
وہ عشق کیا کہ نہ اپنی ہمیں خبر آئے

جمیلؔ ہم نے پکارا تو حُسن والے بھی
فرازِ عرش سے اترے زمین پر آئے

○

نہ تم میں خوئے ستم ہی رہی نہ بوئے غرور
ہمیں تمہاری محبت کا اِعتبار آیا

○

کچھ کہو خرد منداں یہ دیار کیسا ہے
عشق ہے سو رسوا ہے حسن ہے سو تنہا ہے

نیلگوں خموشی میں چاند سا ابھرتا ہے
یہ مرا تخیل ہے یا ترا سراپا ہے

خوشنما سرابوں سے تشنگی نہیں بجھتی
اُس کی سمت کیا دیکھیں جو نظر کا دھوکا ہے

وا ہیں صد ہزار آنکھیں پھر بھی بے بصیرت ہیں
کچھ نظر نہیں آتا یہ عجب اجالا ہے

ریگزار ماضی میں آندھیاں سی چلتی ہیں
رات کی خموشی میں دل سے شور اٹھتا ہے

کارواں ستاروں کے لٹ گئے اندھیروں میں
ذہن کے دھندلکے میں اک چراغ جلتا ہے

ٹھوکروں کے متوالو اب تو راہ پر آؤ
سوگوار دنیا کا آخری سنبھالا ہے

○

گزرے گا کب اِدھر سے کوئی کشتۂ جنوں
پیاسے ہیں خار، آبلہ پا کو ترس گئے

رستے میں کون تھا جو اڑا لے گیا اُسے
غنچہ دہن چمن میں صبا کو ترس گئے

مہتاب زرد زرد، ستارے بجھے بجھے
یہ شب چراغ اپنی ضیا کو ترس گئے

اندھے کنوئیں سے آؤ نکالیں انھیں جمیلؔ
جو لوگ روشنی کو، صدا کو ترس گئے

○

کب زمانے کا گِلہ کرتے ہیں
اپنی آواز پہ خود مرتے ہیں

دوست بھی جب سے ستم گر نکلے
دشمنوں سے بھی وفا کرتے ہیں

پسِ دیوار کھڑا ہو نہ کوئی
بات بھی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں

جس کو الفاظ کا پیکر نہ ملا
ہم اُسی بات کا دم بھرتے رہیں

○

جب دشتِ زندگی سے ہمارا گزر ہوا
ہر خار یوں چبھا کہ شریکِ سفر ہوا

افتاد وہ پڑی ہے کہ دونوں ہیں سر بہ جیب
تیری وفا ہوئی کہ ہمارا ہنر ہوا

یادوں کے پھول روح میں کانٹے چبھو گئے
میں فکرِ بیش وکم سے اگر بے خبر ہوا

تیرے بغیر بھی کہیں آسودگی نہ تھی
جب تو ملا تو ہم پہ ستم بیشتر ہوا

جب پھول بجھ گئے، تو شگوفے دمک اٹھے
افسانۂ وجود و عدم مختصر ہوا

ہوگا وہاں بھی نیشِ غمِ زندگی جمیلؔ
دامانِ گلستاں بھی اگر اپنا گھر ہوا

○

شبِ سیاہ کی زلفوں میں نور بھر جاتے
جہاں میں آئے تھے ہم، کوئی کام کر جاتے

ہمیں لٹے بھی، ہمیں کو پناہ بھی نہ ملی
سیاہ اُن کی نگہباں تھی، ہم کدھر جاتے

دل و نظر کا مقدر رہی ہے تنہائی
کسی کو پاس بُلاتے، کسی کے گھر جاتے

یہ راہ مقتلِ اہلِ ہنر کو جاتی ہے
کبھی تو تم بھی اسی راہ سے گزر جاتے

ہمیں ملا ہی نہیں کوئی سایہ دار شجر
گھنیری چھاؤں میں شاید ذرا ٹھہر جاتے

تمام عمر میں اتنی سی بات بھی نہ ہوئی
جمیلؔ ڈوبنا آتا تو پار اُتر جاتے

○

کسی صحرا کو نکل جائیں اگر گھر نہ ملے
کیا کریں ہم جو ترے حسن کا جوہر نہ ملے
اپنے احساس کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں
جن کو چھاؤں نہ پکارے جنہیں منظر نہ ملے
کب تری راہ میں کلیاں نہ بکھیریں ہم نے
کب ترے بام سے ہر گام پہ پتھر نہ ملے
راہ و منزل کے خم و پیچ اُسے کیا معلوم
جس کو ٹھوکر نہ لگے جس کو ستمگر نہ ملے
جس طرف جائیں نظر آئیں فسردہ چہرے
رم آہو نہ ملے حسن کا پیکر نہ ملے
کون پھر خیر منائے ترے میخانے کی
تشنہ کاموں کو اگر زہر کا ساغر نہ ملے

شعر کیوں کہو اگر عالمِ سرشاری میں
دوستو ہم کو کوئی عالمِ دیگر نہ ملے؟

○

تھا تیز بہت قافلۂ صبحِ بہار
دیکھا تو نہ تھا کچھ بھی بجز گرد و غبار
دنیا تھی کہاں اور کہاں آ پہنچی
یہ کیا کہ وہی ہم ہیں وہی لیل و نہار

کانٹوں کی انی اور یہ ننھی جانیں
شاخوں سے چٹکتی ہوئی کلیاں نہ اتار
وہ بھیگی ہوئی رات، وہ رِم جھِم باتیں
جیسے کہیں پڑتی ہو گلستاں میں پھوار

جب رختِ سفر باندھ لیا، باندھ لیا
ہر راہگزر اب ہے مری راہگزار
خوشبوئے بدن شعلۂ آواز بنی
وہ سامنے آتا ہے نظر شہرِ نگار

کچھ فرق غمِ دل، غمِ دنیا میں نہیں
اس زلف کا حلقہ ہی بنا حلقۂ دار

○

ہے جس کیلئے نیشِ غمِ جاں بھی گوارا
رہتا ہے اسی شہر میں وہ انجمن آرا

روشن ہے بہت کوچۂ دلدار، سنا ہے
چمکا ہے وہاں میرے مقدر کا ستارا

سلجھی ہے تری زلف، تو اُلجھے ہیں مرے کام
تو ہار کے جیتا ہے تو میں جیت کے ہارا

اُسوقت بھی چپ چاپ خدا دیکھ رہا تھا
جب کوئے ملامت میں نہ تھا کوئی ہمارا

ہر لفظ کے سینے سے لہو پھوٹ رہا ہے
تاریخ کے اوراق سے یہ کس نے پکارا

○

کوئی حسرت، کوئی ارماں نہیں دل میں باقی
کیا ہوا، کوئی غزل خواں نہیں دل میں باقی

ہم پہ جو تیر چلے، سینۂ دشمن میں لگے
ہوسِ غمزہ و مژگاں نہیں دل میں باقی

لالہ و گل کی طرح زخم کھلے ہیں کیا کیا
ایک بھی گوشۂ ویراں نہیں دل میں باقی

ہم سنائیں گے بہرحال فسانہ دل کا
اب وہ پابندیٔ عنواں نہیں دل میں باقی

جتنے در بند ہوئے اور ہنرمند ہوئے
شکوۂ گردشِ دوراں نہیں دل میں باقی

○

شریکِ جرم ہیں وہ بھی، اِسے خطا کہیئے
درازدستیِ قاتل کو کیا بُرا کہیئے

رہینِ لفظ و بیاں اپنی واردات نہیں
سکوت خود ہی صدا ہے زباں سے کیا کہیئے

بتوں کو ہم سے شکائت، خدا کو ہم سے گلہ
سنے گا کون، کِسے دل کا مدعا کہیئے

ہمیں تو اپنی محبت کا پاس ہے یارو
وہ بے وفا ہیں تو کس مُنہ سے بے وفا کہیئے

ہزار بار خزاں نے ہمیں کیا پامال
بہار آکے نہ ٹھہری، قضا کو کیا کہیئے

کِسے جمیل گلے سے لگائیں فرقت میں
بغیرِ دوست کسے درد کی دوا کہیئے

○

رو رو آنسو خشک ہوتے برسات آئی، برسات گئی
کون کہے، اب کس کے دوارے اشکوں کی بارات گئی

بیتے سال کی بات ہے کیا کیا چھم چھم بادل برسے تھے
اب کے برس تم پاس نہیں تو بن برسے برسات گئی

کس امید پہ جیون کاٹیں، کس سے من کی بات کہیں
تیرے ملن کی آس بھی جھوٹی، وہ بھی تیرے ساتھ گئی

سنگی ساتھی پاس نہیں تھے، دشمن گھات میں بیٹھے تھے
جان سی چیز ملی تھی ہم کو وہ بھی ہاتھوں ہات گئی

ڈوب گئے آشا کے تارے، راکھ ہوئے پروانے بھی
نگر نگر کے دیپ بجھا کر اب کس دیس میں رات گئی

جگ سے توڑ کے رشتے ناطے کیوں گم سم بیٹھے ہو جمیل
اٹھو سورج سر پر آیا رات کے ساتھ وہ بات گئی

(۰)

اپنی آنکھوں میں چھپائے ہوئے افسانے سے
اپنے ہی شہر ہیں کیوں بھیگ رہے ہو بیگانے سے
اُس کے ہاتھوں میں بجز چاک گریباں کیا ہے
جانے کیوں ڈرتی ہے دُنیا ترے دیوانے سے
عشق اور آگ میں کیا فرق ہے پوچھو تو سہی
شمع کی لو پہ مچلتے ہوئے پروانے سے
مست پندار تھے وہ اُن سے طلب کیا کرتے
آج پیاسے ہی چلے آئے ہیں میخانے سے
یوں مرے دل میں ابھرتا ہے تمہارا پیکر
جیسے بادل کوئی اٹھے کسی ویرانے سے
یاد کے ساتھ کھنک اٹھتی ہیں بیتی باتیں
دل بھر آتا ہے چھلک جاتے ہیں پیمانے سے

پھیل جاتی ہے جمیل اپنے نفس کی خوشبو
بات ہوتی نہیں بن جاتے ہیں افسانے سے

○

کس طرف سے تری جانب آؤں
جہاں سنبھلوں وہیں ٹھوکر کھاؤں

تو ہی جب حاصلِ امید نہیں
کس کو موضوعِ سخن ٹھہراؤں

دل ترا پھول ، بدن انگارہ
تجھ کو چاہوں کہ یہیں جل جاؤں

تو مری روح کا اظہار تو ہے
میں بھی تیری ہی ادا ہو جاؤں

تیری آواز کے پیچھے بھاگوں
میں، کہ خود مطربِ جاں کہلاؤں

جس پہ ھنگامۂ عالم ہو نثار
وہ شب و روز کہاں سے لاؤں

ڈھونڈھ کر لاؤں جمیل اپنا جواب
دل کے گنبد کی صدا بن جاؤں

○

جو دل کے داغ تھے بھیگی ہوا سے دھو لیتے
کہیں پہاڑ کے دامن میں چھپ کے رو لیتے

تمام رات ترے خواب دیکھتے گزری
شبِ فراق نہ ڈھلتی، کچھ اور سو لیتے

بلا رہی تھی نوائے رحیل و بانگِ جرس
پڑے ہیں راہ میں کیوں ہم بھی ساتھ ہو لیتے

خوشی کے پھول بھی کھلتے، بہار بھی آتی
زمینِ درد میں اشکوں کے بیج بو لیتے

گھنیری زُلف کی چھاؤں، نہ سایۂ دیوار
کہیں جمیل گھڑی بھر کو سانس تو لیتے

○

اجلے بستر پر سوہنا کام ہے دُنیا داروں کا
سڑکوں پر آوارہ پھرنا، طور ہے دل کے ماروں کا

دل کا چور زباں پر آکر کیا کیا رنگ بدلتا ہے
پیار کی میٹھی باتوں نے بھی کام کیا تلواروں کا

اپنا آپ لٹا کر یوں ہم تیری راہ میں بیٹھے ہیں
جیسے کوئی پت جھڑ میں بھی دیکھے خواب بہاروں کا

تم کس کارن جوگی بن کر مارے مارے پھرتے رہو
سودا کر کے چل دینا تو پیشہ ہے بنجاروں کا

یاروں کی کڑوی باتوں پہ رونا آنکھیں کھونا کیا
چاہے اپنی جان بھی جائے ساتھ نہ چھوٹے یاروں کا

○

تم بھی برسات کے بادل نہ ہوتے
دل کے صحرا کبھی جل تھل نہ ہوتے

پیکرِ ہوش و خرد کہلاتے
کیوں ترے عشق میں پاگل نہ ہوتے

خار بن کر ترے دل میں اُترے
جو ترے پاؤں کی چھاگل نہ ہوتے

بہہ گئے صورتِ اشکِ خونیں
جو تری آنکھ کا کاجل نہ ہوتے

خاک میں مل کے ہوئے گوہرِ جاں
کسی گلنار کا آنچل نہ ہوتے

ہو گئے ترکشِ لب سے چھلنی
ہم، کہ تلوار سے گھائل نہ ہوئے

آبلہ پا تھے مگر چلتے رہے
پاؤں زخمی تو ہوئے، شل نہ ہوئے

کب ترے گھر میں چراغاں نہ کیا
کب تری راہ میں مشعل نہ ہوئے

جان بھی تم پہ نچھاور کی ہے
اپنی افتاد پہ بے کل نہ ہوئے

O

منزلِ ہستی کسی صورت سے طے ہو جائے گی
زندگی کے موڑ تیرے گیسوؤں کے خم نہیں

○

غبارِ کارواں جس رہگزر سے اُٹھ رہا ہوگا
وہاں تیرا پتہ کوئی مسافر پوچھتا ہوگا

دھواں اٹھتا ہے دیکھو گھر کسی کا جل بجھا ہوگا
کھلی آنکھوں سے یہ منظر بھی کوئی دیکھتا ہوگا

اندھیری رات میں شاید وہ اپنا راہنما ہوگا
مری پلکوں پہ جو روشن ستارا کانپتا ہوگا

فلک کے نقرئی آنسو ستارے بن گئے ہوں گے
زمیں کا چاند بے پایاں خلا میں کھو گیا ہوگا

مرا رونا ترے کھلتے ہوئے ہونٹوں کی شبنم ہے
ترا ہنسنا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوگا

اگر ہونٹوں کو سی لیں تو خموشی بول اٹھے گی
اگر ہم برملا کہہ دیں تو چرچا جا بجا ہوگا

جمیلؔ اب تو یہ کہتے ہو وہ جانِ آفتاب آئے
نگاہیں جل نہ جائیں گی جب اس کا سامنا ہوگا

○

دوستوں کے درمیاں بھی ہم کو تنہا دیکھتے
تم کبھی آتے سرِ محفل تماشا دیکھتے

آئینہ خانوں میں کیا رکھا ہے حیرت کے سوا
کوچہ و بازار میں خونِ مسیحا دیکھتے

موت کو بھی ہم بنا لیتے متاعِ زندگی
قتل یوں ہوتے کہ سب دانا و بینا دیکھتے

قیس کی مانند کیوں تصویر بن کر رہ گئے
پردۂ محمل اٹھا کر روئے لیلیٰ دیکھتے

میں تمہارے حسن کا بے ساختہ اظہار ہوں
اپنے آئینے میں میرا بھی سراپا دیکھتے

ڈھونڈھنے نکلے ہیں تجھ کو ماورائے آب و گل
عمر گزری یم بہ یم، صحرا بہ صحرا دیکھتے

کیا یہ کم ہے فرش سے تا عرش ہو آئے جمیلؔ
چار دن کی زندگی میں اور کیا کیا دیکھتے!

○

دن بھر تیری دید کو ترسے
شام ہوئی اور نکلے گھر سے

روحیں جنم جنم کی پیاسی
کیا جانے کب ساون برسے

دنیا کا تو خوف نہیں تھا
کھوئے گئے اپنوں کے ڈر سے

اپنے آپ سے کیوں کر بھاگیں
چھپ تو گئے دنیا کی نظر سے

اندر اندر کھوٹ بھرا ہے
چمک دمک باہر باہر سے

کوئی سہارا کام نہ آیا
موج اٹھی اور گزری سر سے

روح کے گھاؤ دیکھ سکو گے!
ہم کیا سر پھوڑیں پتھر سے

دامن خالی، آنکھیں ویراں
لوٹ کے آیا کون سفر سے

راہیں بند، زبانیں ساکت،
کچھ تو کہو ہم جائیں کدھر سے

کب ٹوٹے گا یہ سناٹا
پوچھ رہا ہوں شام و سحر سے

○

ہر ایک زخم کو برگِ حنا سمجھتے ہیں
ہم اپنے دل کی لگی کو دوا سمجھتے ہیں
یہ داغِ حسرتِ دل، یہ چراغِ محفلِ جاں
یہی تو غم ہے جسے دیرپا سمجھتے ہیں
تم اپنا ظلم ہمارے حساب میں لکھ دو
اسے بھی اپنے کئے کی سزا سمجھتے ہیں
وفا تو حسنِ تخیل ہے اس کا ذکر ہی کیا
تری جفا کو بھی اپنی خطا سمجھتے ہیں
ہزار روپ بھر کر، لاکھ پیرہن بدلے
سمجھنے والے، تری ہر ادا سمجھتے ہیں
یہ معجزہ ہے ازل سے رفیقِ تنہائی
ندائے دل کو صدائے خدا سمجھتے ہیں

ہوئی ہے جب سے خوشی دلبروں کے گھر کی کنیز
جمیلؔ غم کو بھی ہم دلربا سمجھتے ہیں

○

چلتے چلتے راستے خود ہی جدا ہوتے گئے
مدتوں کے آشنا، ناآشنا ہوتے گئے

کیسی کیسی منزلیں اُن کو بلاتی رہ گئیں
زندگی کی راہ میں جو نقشِ پا ہوتے گئے

تم ہماری بے وفائی کا گلہ کرتے رہے
ہم تمہاری کج ادائی پر فدا ہوتے گئے

ہوتے ہوتے امتیازِ دوستی جاتا رہا
یوں تجھے چاہا کہ ہم تیری ادا ہوتے گئے

اپنا ذوقِ بندگی تو عشق کی معراج تھا
وہ خدا کیوں بن گئے کیوں نارسا ہوتے گئے

آج بھی جن کا تصوّر حاصلِ جاں ہے جمیلؔ
وہ زمانے، وہ فسانے کیا سے کیا ہوتے گئے

○

نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے کوئی
اب تو ہنگامہ نہیں ہے کوئی

سنگ و آہن کے ہیں یہ لوگ، اِن کا
دل بھی پتھر کا نگیں ہے کوئی

زندگی ہے کہ حقیقت کا سراب
تم ہو یا خوابِ حسیں ہے کوئی

پاس اتنا کہ دکھائی بھی نہ دے
دور اتنا کہ نہیں ہے کوئی

یہ زمیں منصبِ اربابِ نظر
اپنا مسجود یہیں ہے کوئی

اپنی تخلیق کو حیرت سے نہ دیکھ
بول مجھ سا بھی کہیں ہے کوئی

○

کوئی کہے تو کس سے کہے اپنے جی کی بات
ہونٹوں سے چھین لی ہے کسی نے کسی کی بات

اپنا خلوص ہو کہ تری بے رخی کی بات
دونوں سے بن سکی نہ غمِ زندگی کی بات

دل سے گزر رہی ہے کچھ اس طرح اُن کی یاد
جیسے ہو ان کی بات بھی بیگانگی کی بات

لٹ کر بھی ہنس رہے ہیں مگر کس ادا کے ساتھ
جیسے یہ بات بھی ہو کوئی دل لگی کی بات

جاناں کے روپ میں کبھی دوراں کے رنگ میں
کہتے رہے ہیں آپ سے ہم آپ ہی کی بات

جس کی ادا پہ ہم نے سبھی کچھ لٹا دیا
وہ حرفِ دوستی تھا کہ تھی دشمنی کی بات

مہتاب و آفتاب جلے، راکھ ہو گئے
بھولے سے ہم نے کی تھی یہاں روشنی کی بات

رہبر کو ہم عزیز، نہ منزل ہمیں عزیز
پھر کیوں نہ رہبری بھی بنے گمرہی کی بات

شاعر بھی، نغمہ گر بھی، مصوّر بھی ہے جمیل
سانچے میں ڈھل سکی نہ مگر اپنے جی کی بات

○

اے دل بدل رہا ہے قرینہ حیات کا
تو بھی بدل بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ

○

کتنے ہونٹوں پہ شگوفوں کا بسیرا ہوگا
جب بہار آئے گی، جس وقت سویرا ہوگا

کوئی بھی داغ جہاں سینۂ گیتی میں نہیں
جانے وہ کتنی بہاروں کا بسیرا ہوگا

برق گرتی ہی نہیں ابر برستا ہی نہیں
یہ اندھیرا تو ابھی اور گھنیرا ہوگا

حسن کو گھلا نہ سکی تیرے جواں جسم کی آنچ
اس کو سنگینیٔ حالات نے گھیرا ہوگا

آگ جلتی ہے جمیل اور نہ اٹھتا ہے دھواں
دل کسی میر سے درویش کا ڈیرا ہوگا

○

کوئی سولی ہے کہ رستے میں گڑی ہے کب سے
موت ارزاں ہے بہر گام کھڑی ہے کب سے

کام کب آئے گی وہ تیری مسیحا نفسی
سانس آنکھوں کے جھروکوں میں اڑی ہے کب سے

تو کہاں ہے تجھے اتنی بھی خبر ہے کہ نہیں
تیرے دیوانوں پہ افتاد پڑی ہے کب سے

سر پہ سایہ بھی نہیں، تو بھی نہیں تو بھی نہیں
یہ قیامت سی کڑی دھوپ کھڑی ہے کب سے

وہ نگاہِ غلط انداز وہ نیزے کی انی
میرے احساس کی نبضوں میں گڑی ہے کب سے

○

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں، زخموں کا مداوا نکلے
اِس بھرے شہر میں کوئی تو مسیحا نکلے

اُف یہ انبوہِ رواں، ہائے مری تنہائی
کہیں رستہ نظر آئے، کوئی تم سا نکلے

چاند سے چہروں پہ پتھرائی ہوئی زرد آنکھیں
کوئی بتلاؤ یہ کس شہر میں ہم آ نکلے

پسِ دیوار کھڑا ہے کوئی تنہا کب سے
تو نہ نکلے، ترے گھر سے ترا سایا نکلے

جن پہ سو ناز کرے انجمن آرائی بھی
غور سے دیکھا تو وہ لوگ بھی تنہا نکلے

یہ ستاروں کے تڑپتے ہوئے سیمیں پیکر
جانے کب رات ڈھلے، نور کا دریا نکلے

چاند سورج سے بھی تاریکیٔ دوراں نہ گئی
دیکھئے پردۂ تخلیق سے اب کیا نکلے

○

زیرِ زمیں ملا، نہ تہہِ آسماں ملا
ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ پیکر کہاں ملا

تم ڈھونڈھنے چلے ہو کسے چاند رات میں
کب چاند کو بھی منزلِ شب کا نشاں ملا

ہر اک سے پوچھتا ہوں سرِ رہگزارِ شوق
کیا تم کو راستے میں کوئی ہم زباں ملا

جب زندگی پہ طنز ہوئی شامِ زندگی
وہ مہرباں ملا بھی ہمیں، تو کہاں ملا

پھر اُس کے بعد دل پہ جو گزری، گزر گئی
اک شخص زندگی میں ہمیں ناگہاں ملا

ہم آئینہ بھی جس کے مقابل نہ لائے تھے
وہ جب ملا تو ہم سے بہت بدگماں ملا

مرنے کا مرحلہ ہو کہ جینے کی قید ہو
جو غم ملا جمیلؔ غمِ جاوداں ملا

○

جو خیال آیا، تمہاری یاد میں ڈھلتا رہا
دل چراغِ شام بن کر صبح تک جلتا رہا

ہم کہاں رکتے کہ صدیوں کا سفر درپیش تھا
گھنٹیاں بجتی رہیں اور کارواں چلتا رہا

کتنے لمحوں کے پتنگے آئے، آ کر جل بجھے
مَیں چراغِ زندگی تھا تا ابد جلتا رہا

حسن کی تابانیاں میرا مقدر بن گئیں
چاند میں چمکا، کبھی خورشید میں ڈھلتا رہا

جانے کیا گزری کہ فرزانے بھی دیوانے ہوئے
مَیں تو شاعر تھا خود اپنی آگ میں جلتا رہا

○

بھنور بھنور میں سفینے اتارنے والے
کہاں ہیں تندیٔ طوفاں سے ہارنے والے

جبیں پہ گرد، زباں گنگ، پاؤں میں چھالے
یہی ہیں کاکلِ گیتی سنوارنے والے

ادھر بھی کوئی ستارا، ادھر بھی کوئی چراغ
فلک پہ چاند ستارے ابھارنے والے

اُٹھے تو لے کے بڑھے آفتاب سے جھپکر
شبِ سیاہ کو رو رو گزارنے والے

برنگِ نکہتِ گیسو بکھر گئے ہر سو
چمن چمن ترے غم کو نکھارنے والے

مزہ تو جب تھا کہ طوفاں میں ساتھ بھی دیتے
جمیلؔ دُور سے ہم کو پکارنے والے

○

خواب و افسانہ ہوا لیلیٰ محمل کا وصال
پھر وہی وسعتِ صحرا ہے وہی گردِ ملال
یوں تمنائیں اُبھرتی ہیں بکھر جاتی ہیں
جیسے ہونٹوں پہ لرزتے ہوئے بے نام سوال
کن خرابوں میں ہوئے دفن رفیقانِ سفر
وقت یوں گنگ ہے جیسے کوئی فردا نہ حال
موت، ٹھہری ہوئی آوازِ شکستِ دل کی
زندگی ایک طلب، ایک خلش، ایک سوال
لُوٹ کر لے گئے کچھ لوگ ترا حسن و شباب
اے زمیں بول کہاں ہے ترا صدیوں کا جلال
آج پھر سطوتِ پرویز ہے شیریں بکنار
اپنے پیکر سے کوئی تیشۂ خوں رنگ نکال

دُور تا حدِ نظر گھور اندھیرا ہے مگر
چاندنی بکھری ہوئی ہے سرِ دامانِ خیال

○

دیوار ہے ہم زباں، نہ در ہے
دل اجڑا ہوا اداس گھر ہے

اب کس کی وفا پہ ناز کیجے
اس شہر میں کون معتبر ہے

منزل کی طرف رواں ہوں تنہا
صدیوں کا خلوص ہمسفر ہے

ذرّوں کا بھی دل ٹٹولتے ہیں
وہ جن کی نگاہ عرش پر ہے

آئینہ بدست ہے زمانہ
انسان ازل سے خود نگر ہے

ٹھہروں تو کہاں، رکوں تو کیسے
درپیش حیات کا سفر ہے

ہم صرف تمہیں کو دیکھتے ہیں
دنیا کی کہاں کہاں نظر ہے

○

جب اہل فکر میں ہوتے ہیں اہل فن پیدا
ہر ایک بات سے کرتے ہیں سو سخن پیدا

نہ تن کو ہوش ہے اپنا نہ جان کو فرصت
کسی طرح نہ ہوا ربطِ جان و تن پیدا

یہ بات کیا ہے کہ سب اہلِ انجمن چپ ہیں
کہیں سے کوئی تو ہو جان انجمن پیدا

جو لوگ راہ محبت میں کام آتے ہیں
انہیں کی خاک سے ہوتے ہیں کوہکن پیدا

زمیں پہ ہم نے بنائے لہو سے نقش و نگار
جہاں بھی دفن ہوئے کر دیتے چمن پیدا

ہر ایک دور کے آذر تراشتے ہیں صنم
ہر ایک دور میں ہوتے ہیں بت شکن پیدا

برنگِ خار اترتے رہے دلوں میں جمیل
نوائے شوق میں ہوتی رہی چبھن پیدا

ایک انجان پہ یہ طرفہ عنایت کیسی
مجھ سے بڑھ کر، مری صورت سے محبت کیسی

سب کی قسمت میں کہاں عشق میں رسوا ہونا
اپنے ناکردہ گناہوں پہ ندامت کیسی

شرم و ناموس کے بازار لگے ہیں کیا کیا
حسن کس چیز کو کہتے ہیں شرافت کیسی

اپنے احساس کی خوشبو سے مہکتا ہے گلاب
ہونٹ کھلتے ہوں تو سینے میں کدورت کیسی

اب تو لگتے ہیں بھرے شہر بھی ویرانے سے
ہر طرف کوچہ و بازار میں وحشت کیسی

گمرہی سے ہی ہمیں ذات کا عرفان ہوا
کھو گئے ہم تو زمانے سے شکایت کیسی

کچھ نہیں چاہتے ہم درد کی دولت کے سوا
اے مسیحا نفساں ہم سے عداوت کیسی

زندگی جن کی کٹی نام کی شہرت میں جمیل
اُن کی نظروں میں ترے کام کی عظمت کیسی

○

تری نظر کے دیئے میری آرزو کے چراغ
جلے تو پھر نہ بجھے شہرِ جستجو کے چراغ

زباں خموش رہی سنگِ آستاں کی طرح
دمک اٹھے تری آنکھوں میں گفتگو کے چراغ

بہارِ لالہ و گل ہے کہ تیرا پیراہن
ترے جمال کی ضو ہے کہ رنگ و بو کے چراغ

ہوس کدوں میں ابھی تک وہی اندھیرا ہے
جلے ہیں یوں تو بہت حسنِ کو بکو کے چراغ

جہاں میں جشنِ چراغاں تو ہو رہا ہے مگر
بھڑک کے آگ لگا دیں نہ یہ لہو کے چراغ

جو ہو سکے تو جلاؤ نگاہ کی قندیل
کہ خضرِ راہ نہیں شبنم و سبو کے چراغ

ہوس کی آگ میں تابندگی کوئی دم ہے
جلیں گے تا بہ ابد عشق و آبرو کے چراغ

○

کعبہ و دیر سے پتھر کے صنم نکلیں گے
جب باندازِ جنوں شہر میں ہم نکلیں گے
وہ بھی شمشیر بکف، نعرہ بلب آئیں گے
ہم بھی ہاتھوں میں لئے لوح و قلم نکلیں گے

آج گمنام پڑے ہیں تو شکایت کیسی
کل اسی راہ سے ہم لوگ بہم نکلیں گے
ماہ و خورشید لبِ بام اُتر آئیں گے
یوں شبِ تار، تری زلف کے خم نکلیں گے

جن کا سینہ بھی کشادہ ہو زباں بھی شیریں
ایسے دو چار ہی اربابِ کرم نکلیں گے
کس لئے ڈھونڈتی پھرتی ہے ہمیں موجِ بلا
جو شناور ہیں وہ ہمرازِ عدم نکلیں گے

ذات کو ہم نے بنایا ہے گزرگاہِ حیات
ہم سے درویش بھی اس دور میں کم نکلیں گے

○

فغاں لبوں سے اُتر کر کدھر گئی ہو گی
مقامِ سود و زیاں سے گزر گئی ہو گی

یہ کس دیار میں کھوئے گئے ہیں دیوانے
نگاہِ شیشہ گراں کام کر گئی ہو گی

یہ بات کیا ہے کہ ذرّے بھی آفتاب ہوئے
کہیں اِدھر سے نگارِ سحر گئی ہو گی

کلی کلی کو صبا نے جگا دیا ہو گا
فضا تبسمِ گل سے نکھر گئی ہو گی

چراغ تیرے تصوّر سے جل اٹھے ہوں گے
ترے جمال سے دنیا سنور گئی ہو گی

فغانِ نیم شبی، ماورائے کون و مکاں
حدوں کو پھاند کے بے بال و پر گئی ہو گی

جمیلؔ ہم نہ سہی، کارگاہِ ہستی میں
ہمارے بعد، ہماری خبر گئی ہو گی

○

رہِ حیات میں گرتے رہے ، سنبھلتے رہے
نظر اٹھا کے بڑی تمکنت سے چلتے رہے

ہمارا شیشۂ پندار توڑنے والے
تمام عمر ندامت سے ہاتھ ملتے رہے

گیا ، تو کوئی مسافر نہ لوٹ کر آیا
تمام شب مرے گھر کے چراغ جلتے رہے

ہمیں یہ ڈر تھا تو آ کر بھٹک نہ جائے کہیں
مثالِ شمع ، سرِ رہگزار جلتے رہے

گہر تھے ، بحر کے سینے میں کیوں چھپے رہتے
اٹھی جو موج تو تہہ سے بھی ہم اچھلتے رہے

ترے جمال کی لو سے جلا کے دل کا دیا
ترے خیال کے خلوت کدے میں جلتے رہے

ہے انتظار ابھی تک طلوعِ فردا کا
ابھر ابھر کے کئی آفتاب ڈھلتے رہے

○

کل ذکر تھا گلشن میں تری گُلبدنی کا
غم بھول گئے یار، بہارِ چمنی کا

موسم نے پہن رکھا ہے پھولوں کا لبادہ
بہروپ ہے یہ بھی تری گل پیرہنی کا

جو بھی تجھے دیکھے ترے ہونٹوں میں سما جائے
سمٹا سا یہ انداز تری کم سخنی کا

آنکھوں سے جھلکتے رہے گھر کے در و دیوار
ہونٹوں پہ فسانہ تھا غریب الوطنی کا

بسمل کی طرح اس کو تڑپنا نہیں آتا
یہ دل، کہ ہدف ہے تری ناوک فگنی کا

ہیں آج وہی راہبر و خضر ہمارے
کل جن کو سلیقہ بھی نہ تھا راہزنی کا

میخانۂ جم ہو کہ صنم خانۂ آذر
چھوڑا نہیں انداز کوئی بت شکنی کا

اب تیشۂ فرہاد کا انعام ہے شیریں
انجام نہیں مرگِ وفا۔ کوہکنی کا

وہ جن کو نہیں میری خموشی بھی گوارا
دعویٰ ہے جمیلؔ ان کو مری ہم سخنی کا

○

حضور آپ کے نازک مزاج، کیا کہنا
ذرا سی بات پہ زنجیر ہم کو پہنا دی

○

تاروں کی انجمن میں، نہ شمس و قمر میں ہے
وہ روشنی جو دیدۂ اہلِ ہنر میں ہے

یوں لہلہا رہی ہے مرے دل میں چاندنی
جیسے وہ ماہتاب، یہیں میرے گھر میں ہے

یہ زندگی کا کھیل ، بہت مختصر سہی
اک حسن ، اک اٹھان تو رقصِ شرر میں ہے

وہ ناز و غمزہ دشنہ و دشنام کیا ہوئے
بیٹھی ہوئی سپاہ تری رہگزر میں ہے

صدیاں گزر گئیں ، اسے کوئی نہ پا سکا
جو حرفِ التماس ہماری نظر میں ہے

صبحِ ازل چلا تھا کوئی رختِ جاں لئے
دیکھ اے ابد کی شام، مسافر سفر میں ہے

چمکائے گا کچھ اور زمانہ اسے جمیل،
راتوں کا سوز و ساز اگر چشم تر میں ہے،

○

کھُلے رستوں میں ہم تنہا کھڑے ہیں
امیدوں کے نگر سونے پڑے ہیں

صلیبیں راستہ روکے کھڑی ہیں
وفا کے مرحلے کتنے کڑے ہیں

یہی ہے زندگی تو موت کیا ہے
زمیں کی کوکھ میں زندہ گڑے ہیں

اِدھر بھی اک نظر، حسنِ گریزاں
یہاں اُک موڑ پر ہم بھی کھڑے ہیں

جمیلؔ اِن کے سہارے جی لئے ہم
ہمارے حوصلے ہم سے بڑے ہیں

○

(نذیر احمد ظفر)

میں اپنے سینے میں تیرے زخموں کا درد محسوس کر رہا ہوں
اُدھر تو جہاں سے گزر رہا ہے اِدھر میں بے موت مر رہا ہوں

مری نگاہوں میں ایک اک سنگ میل کتبہ ہے آگہی کا
وجود میرا اُبل رہا ہے، عدم کے دل میں اُتر رہا ہوں

کہی ہے تو نے جو راستوں میں سُنی ہے میں نے وہ منزلوں پر
یہ راہ و منزل کا فرق کیسا کہ میں ترا ہم سفر رہا ہوں

بہر قدم لُٹ رہی ہے لیکن یہ زندگی پھر بھی زندگی ہے
تو دانہ دانہ پرو رہا ہے، میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں

ہمارے چہروں کی روشنی سے شبِ الم جگمگا اٹھی ہے
تو چاند بن کر ابھر رہا ہے، میں نور بن کر بکھر رہا ہوں

ازل کی خوشبو ابد کے سینے کی دھڑکنوں میں گھلی رہیگی،
تو قطرہ قطرہ گہر ہوا ہے، میں سایہ سایہ شجر رہا ہوں

•

ہمارا فن اپنی پیاس بھی دردِ مشترک کی اساس بھی ہے
تو میری تخلیق میں مگن ہے، میں تیری تزئین کر رہا ہوں

○

یہ آسمانوں پہ رہنے والے، یہ نازپرور، یہ شاہزادے
زمیں کے سینے میں کتنے گھاؤ ہیں کوئی ان کو ذرا بتا دے

یہ جیسے کچھ جانتے نہیں ہیں، انہیں ذرا بھی خبر نہیں ہے
تمہارے کوچے میں رہنے والے بھی کتنے بھولے ہیں، کتنے سادے

دلوں کی کلیاں چٹک چٹک جائیں، زندگی پر بہار آئے
اگر وہ رُخ سے نقاب اٹھا دے، اگر وہ اکبار مسکرا دے

بھرم نہ کھل جائے رہبری کا، خبر کرو میرِ کارواں کو
سنا ہے، لاوا اگل رہے ہیں مسافروں کے جواں ارادے

فریب دے کر شہنشہوں نے ہمیشہ جیتی ہوس کی بازی
حیات نو چال چل گئی ہے، نہ مات کھائیں گے اب پیادے

○

وہ برقِ حُسن نہیں، غمزۂ بہار نہیں
نظر کے ساتھ جو دل بھی شکار کر نہ سکے

نمودِ صبح سے پہلے ہی جاں پہ کھیل گئے
جو کشتگانِ سحر انتظار کر نہ سکے

حضورِ شاہدِ گل کیا وہ سرخرو ہوں گے
جو خونِ زیست کو نذرِ بہار کر نہ سکے

دل و دماغ سبھی یاروں نے بیچ ڈالے تھے
نبیلؔ ہم یہ روش اختیار کر نہ سکے

○

کسی کے غم کو اپنائیں، کسی کی آرزو کر لیں
اگر منزل نہیں ملتی تو آؤ جستجو کر لیں

گلستانوں کے کانٹے بھی چٹک کر پھول بن جائیں
اگر انسان تکمیلِ جہانِ رنگ و بو کر لیں

ترے پہلو میں بھی آئیں گے اک دن تیرے دیوانے
ذرا دار و رسن سے تو یہ پہلے گفتگو کر لیں

بہت دن ہو چکی دیوانگی اب ہوش لازم ہے
گریبانوں کو سی لیں دامنوں کو ہم رفو کر لیں

○

حسن لو دیتا رہا زیست کے ایوانوں میں
رنگ و آہنگ کہاں موت کے افسانوں میں

پھول ہی پھول نہیں باعثِ تزئینِ بہار
کچھ تو کانٹوں کا بھی حصّہ ہے گلستانوں میں

شب چراغوں کی ضیا ماند ہوئی جاتی ہے
آگئی ایک نئی روشنی پروانوں میں

دیکھ تہذیبِ کہن معجزۂ فکر و عمل
کتنی رونق نظر آتی ہے بیابانوں میں

ہم پہ بھی ایک نظر، تیرہ نصیبوں کی سحر
ہم بھی ہیں آج سے شامل ترے دیوانوں میں

اب سنور جائے یہ دُنیا تو عجب کیا ہے جمیلؔ
اک سلیقہ سا چلا آیا ہے اِنسانوں میں

○

جمیل چاند ہیں مستور جتنے جوہر ہیں
انہیں مَیں ڈھونڈھ رہا ہوں وہ میرے اندر ہیں

قریب و دُور یہاں چاندنی کے پیکر ہیں
مری نگاہ میں کیا کیا حسین منظر ہیں

ہزار بار مَیں ڈوبا ہوں تیری آنکھوں میں
ازل سے راہ میں حائل یہ دو سمندر ہیں

وُہ فرقِ خالق و تخلیق مٹ گیا آخر
یہاں تو جتنے صنم ہیں، تمام آذر ہیں

وہ جن سے مجھ کو شکایت تھی سنگباری کی
جو دیکھتا ہوں تو اب اُن کے ہاتھ پتھر ہیں

ہے رنگ رنگ میں خوشبو بہارِ فردا کی
یہ پھول ہیں کہ مہکتے ہوئے پیمبر ہیں

○

آپ میں گم ہیں، مگر سب کی خبر رکھتے ہیں
گھر میں بیٹھے ہیں، زمانے پہ نظر رکھتے ہیں

نکتہ چیں دیکھئے کس کس پہ نظر رکھتے ہیں
ہم بھی اے دیدہ ورو عیب و ہنر رکھتے ہیں

ہم سے اے گردشِ دوراں تجھے کیا لینا ہے
ایک ہی دل ہے سو وہ زیر و زبر رکھتے ہیں

رہنما کھو گئے، منزل تو بلاتی ہے ہمیں
پاؤں زخمی ہیں تو کیا، ذوقِ سفر رکھتے ہیں

جس نے ان تیرہ اجالوں کا بھرم رکھا ہے
اپنے سینے میں وہ نادیدہ سحر رکھتے ہیں

وہ اندھیروں کے پیمبر ہیں تو کیا غم ہے جمیلؔ
ہم بھی آنکھوں میں کئی شمس و قمر رکھتے ہیں

○

سب کی آنکھوں میں نظر آتی ہے صورت میری
کتنے سانچوں میں ڈھلی ایک محبت میری

دیکھ کس شان سے نکھرا ہے مرا ذوقِ جمال
بن گئی آئینہ تیرے لئے حیرت میری

تیرا پردہ ہی نہیں، میں ترا اظہار بھی ہوں
تیری ہستی سے نمایاں ہے حقیقت میری

تجھ سے کچھ بھی نہ کہوں اپنی وفاؤں پہ ہنسوں
تیری بیگانہ روی اور اذیت میری!

لوگ اب مجھ سے زیادہ ترا دم بھرتے ہیں
پاس بیٹھے ہیں ترے لے کے شکایت میری

پیار کے لمحۂ دیدار کا حاصل ہے فراق
دیکھ لے غور سے جاتے ہوئے صورت میری

وادیٔ مصر میں یوسف کے خریدار بہت
پوچھتے پھرتے ہیں بازار سے قیمت میری

حُسن سونے کے ترازو میں سجا بیٹھا ہے
بیچ بازار بکی آج شرافت میری

میں اگر ہونٹ ہلاؤں تو گنہگار بنوں
وہ اگر مجھ کو سزا دیں تو سعادت میری

رنگ لائے گا جمیلؔ اپنی دعاؤں کا خلوص
یوں تو بیکار نہ جائے گی ریاضت میری

○

محبتوں کو ثبات و قرار ہے ہم سے
جہاں میں رسم وفا پائیدار ہے ہم سے

ہمارا عشق سلامت، تمہارے حُسن کی خیر
یہ جلوہ گاہِ ازل، زرنگار ہے ہم سے

زباں پہ حرفِ شکایت نہ دل میں گردِ ملال
رقیب آج بہت شرمسار ہے ہم سے

نہیں ہے قلب و جگر میں لہو کی بوند نہ ہو
بہارِ سرخیٔ رخسارِ یار ہے ہم سے

ہوئے فقیر تو ہاتھ آ گئی متاعِ نظر
وہ چشمِ ناز بھی امیدوار ہے ہم سے

ہمیں سے بزمِ محبت، ہمیں سے رزمِ حیات
جمیلؔ گردشِ لیل و نہار ہے ہم سے

○

بجھے بجھے سے چمن پر نکھار آئے گا
ادھر بھی قافلۂ نو بہار آئے گا
مچل گیا ہے یہ دل شمعِ زندگی پہ تو کیا
تری طرف بھی تو پروانہ وار آئے گا
نہیں بہار تو اُس گلبدن کا ذکر کرو
وہ خوش خرام ہی لے کر بہار آئے گا
رخِ حیات کو ہم اس قدر سنواریں گے
خود اس کو اپنی اداؤں پہ پیار آئے گا
ترے جمال سے صیقل ہوا ہے شیشۂ دل
اس آئینے میں نہ صدیوں غبار آئے گا
حدودِ وہم و گماں سے گزر تو لے انساں
تمام عالمِ امکاں سنوار آئے گا

سنا ہے بزمِ نگاراں میں رزمِ ہستی سے
جمیلؔ آئے گا اور کامگار آئے گا

○

آنکھیں چمک اٹھی ہیں کہ منزل قریب ہے
ہم جس کی آبرو ہیں وہ ساحل قریب ہے

اے دل نہ تھک کے بیٹھ ذرا اور دو قدم
لیلائے نو بہار کا محمل قریب ہے

پاتال کی خبر بھی تو لائیں گے ڈوب کر
ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ساحل قریب ہے

راہوں کے موڑ کا کل پیچاں سے کم نہیں
تو دور ہے تو کیا، مری منزل قریب ہے

غیروں کی سمت دیکھنے والے اِدھر بھی دیکھ
غیروں کی دوستی سے مرا دل قریب ہے

غم کا جمیل کوئی مداوا تو چاہیئے
یارانِ خوش کلام کی محفل قریب ہے

○

راہِ طلب میں آج یہ کیا معجزہ ہوا
خوابِ عدم میں جو بھی گیا، جاگتا ہوا

میداں میں ہار جیت کا یوں فیصلہ ہوا
دنیا تھی اُن کے ساتھ، ہمارا خدا ہوا

برسوں کی دوستی کا چلن کیا سے کیا ہوا
کس منہ سے ہم ملیں گے اگر سامنا ہوا

صدیوں کا درد، وقت کی آواز بن گیا
پھر سے بپا وہ معرکۂ کربلا ہوا

لایا ہے رنگ، خونِ شہیداں، بفیضِ شوق
نظروں کے سامنے ہے گلستاں کھلا ہوا

پتھر بنے ہوئے تھے، زباں دے گیا ہمیں
احساس کی رگوں میں لہو بولتا ہوا

راہیں سمٹ سمٹ کے نگاہوں میں آ گئیں
جو بھی قدم اٹھا، وہی منزل نما ہوا

آنکھوں میں مشعلیں ہیں فروزاں دوام کی
دل میں ہے تیری یاد کا کانٹا چبھا ہوا

تو منزلِ حیات سے آگے نکل گیا
میں آ رہا ہوں تیرا پتہ پوچھتا ہوا

جاں نذر کی، تو دونوں جہاں مل گئے ہمیں
طے مرگ و زندگی کا ہر اک مرحلہ ہوا

یوں دل میں آج نور کی بارش ہوئی جمیل
جیسے کوئی چراغ جلا دے بجھا ہوا

( )

کسی کا خون ہو سینہ لہو لہو میرا
ہے نخلِ شوق فروزاں و سرخرو میرا

وہ میرے جام میں بھر لائے ہیں لہو میرا
ہزار شکر کہ خالی نہیں سبو میرا

ہزار بار بسایا نئے قرینے سے
ہزار بار لٹا شہرِ آرزو میرا

میں تیری بزم میں پہنچا تو یہ ہوا معلوم
نہ تیرے چاہنے والے مرے نہ تو میرا

اب آکے دیکھ تجھے کھو کے میں نے کیا پایا
ہر اک نگاہ میں ہے عکس ہو بہو میرا

مرا خلوص ، مرا عشق میرے کام آیا
خود اپنی آگ میں جل بجھ گیا عدو میرا

کچھ اس ادا سے جلی میرے جسم کی مشعل
پھیل پھیل گیا نور چار سو میرا

○

اب پہ آئی ہے پھر اُس زلفِ گرہ گیر کی بات
ملتی جلتی ہے اُسی شوخ سے کشمیر کی بات

وادیٔ گل سے چلے، تا درِ زنداں پہنچے
دوستو ایک ہوئی سنبل و زنجیر کی بات

جاں ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں مرنے والے
کھو چکی اپنا بھرم تیر کی، شمشیر کی بات

جو تڑپنے میں مزہ ہے، وہ سِسکنے میں کہاں
یاد کیا کیا ہمیں آئی، دلِ نخچیر کی بات

کیا یہی کم ہے کہ جینے کا چلن مانگتے ہیں
اس سے بڑھ کر تو نہ ہو گی کوئی تقصیر کی بات

مرغزاروں سے جھلستے ہوئے صحراؤں تک
سینہ در سینہ چلی، جذبہ و توقیر کی بات

جبر والوں کو ہوئی مات جمیلؔ آخر کار
پیشِ تقدیر بنی، ناخنِ تدبیر کی بات

○

قضا سے بھی نہ بجھا عشق و آگہی کا چراغ
مرے لہو سے جلا میری زندگی کا چراغ

اُلجھ رہی ہے سیاہی سے روشنی کی لکیر
یہ دشمنی کا دھواں ہے، وہ دوستی کا چراغ

ان آندھیوں کا، بگولوں کا کیا گلہ کیجے
جب آدمی ہی بجھاتا ہو آدمی کا چراغ

یہ کس دیار سے آئی ہے رفتگاں کی صدا
ہنسی تمام ہوئی، گُل ہوا خوشی کا چراغ

کس آنے والے مسافر کے انتظار میں ہیں
زمانے بھر کی نگاہیں، تری گلی کا چراغ

دیے بجھے ہیں تو کیا ضو فشاں ہے ماہِ تمام
تمہارے بس میں نہیں ہے یہ چاندنی کا چراغ

بڑھاؤ ہاتھ، کرو تیز روشنی یارو
تمہارے سامنے رکھا ہے زندگی کا چراغ

اسی سے شمس و قمر کسبِ نور کرتے ہیں
مری نظر میں فروزاں ہے میرے جی کا چراغ

بغیرِ خونِ تمنا، بجز خلوصِ نظر،
جمیلؔ جل نہیں سکتا خود آگہی کا چراغ

○

دلھی زمین کے آنسو چھو کر رو کے مٹیں
فلک مقام ستاروں کے پاس کچھ بھی نہیں

(۱)

جمیل آج یہ طلب وصالِ یار کا ہے
نظر کے سامنے منظر تمام دار کا ہے

مری وفا کو بھی جس نے جفا کا نام دیا
زباں پہ حرفِ سخن اُس ستم شعار کا ہے

تری وفا کا یقیں بھی ہے اور نہیں بھی ہے
پھر آج مرحلہ درپیش تیرے پیار کا ہے

تو مجھ سے دور سہی پھر بھی میرے پاس ہے تو
کہ میرے درد سے رشتہ ترے قرار کا ہے

وہ دن بھی تھے کہ تلاشِ بہار تھی مجھ کو
مری تلاش میں اب قافلہ بہار کا ہے

جو تو ملے تو رگ جاں مہک مہک جائے
کہ میرے دل میں بھی تیرے انتظار کا ہے

کھلے ہیں پھول بہر سو تمہاری چاہت کے
یہاں تو جو بھی ہے موسم وہی بہار کا ہے

یہ کس نے خون بکھیرا ہے میری راہوں میں
فضا میں رنگ ترے حسن سوگوار کا ہے

جمیلؔ قلزمِ خوں کو بھی سیلِ گل ہی کہو
کہ یہ تمام سفر جبر و اختیار کا ہے

ہ

نہ گردشِ صبح و شام بدلی، نہ یہ طلسمِ جہاں ہی ٹوٹا
جمیلؔ مدت سے ایک محور پہ گھومتی ہے حیات میری

○

(نذرِ غالبؔ)

کیا کوئی منصف زمینوں، آسمانوں پر نہیں
کون سا وہ ظلم ہے جو ناتوانوں پر نہیں

جھک گیا جو سر وہی سنگِ ملامت بن گیا
اب جبینوں کو بھروسہ آستانوں پر نہیں

صورتِ آئینہ چپ ہیں تو بھی آکر دیکھ لے
اب کوئی الزام تیرے بے زبانوں پر نہیں

ہم جسے ڈھونڈا کئے، وہ چشمۂ آبِ حیات
اِن زمینوں پر نہیں، اُن آسمانوں پر نہیں

جو ہماری آرزو ہے وہ تمہارے دل میں ہے
چیز ہم وہ مانگتے تھے جو دکانوں پر نہیں

○

جہاں جہاں خونِ دل گریگا وہاں وہاں روشنی رہے گی
جو زندگی سے عظیم تر ہے، ہماری منزل وہی رہے گی

کسے خبر تھی رقیب و محبوب آج یوں ہم سے آملیں گے
نہ دشمنی دشمنی رہے گی، نہ دوستی دوستی رہے گی

یہ راہ اپنی، وہ راہ اپنی جدھر چلیں سامنے ہے منزل
وہ راہرو ہیں کہ خود ہماری تلاش میں رہبری رہے گی

چلو ذرا آج ریگِ ساحل سے موجِ دریا میں کود جائیں
مزاجِ دریا بھی پوچھ لیں گے، بھنور سے بھی دل لگی رہے گی

خلش سی ہے ناخنِ طلب میں ہمیں کریں گے گرہ کشائی
جہاں کی تقدیر اپنے ہاتھوں بنی تو صدیوں بنی رہے گی

صبا سے گلشن مہک اٹھیں گے، افق پہ لہرائے گا اجالا
ہمارے سینوں میں نور بن کر اگر شب آگہی رہے گی

جو دور افق پار جا چکے ہیں کبھی وہ واپس بھی آسکیں گے
جمیل مانا کہ تا ابد محفلِ نگاراں سجی رہے گی

○

(نذرِ غالب)

جب اُن کی نگاہوں سے ملیں اپنی نگاہیں
قدموں میں سمٹ آئیں سبھی زیست کی راہیں

دشمن سے محبت ہے ترے نام کی خاطر
ہم تجھ سے کریں پیار کہ دشمن سے نباہیں

دیکھیں دلِ آئینہ میں اپنا بھی سراپا
یہ بھی تری تصویر ہے یوں بھی تجھے چاہیں

کیا جانیئے کب پاؤں سے نکلے خلشِ خار
کیا جانیئے لے جائیں کہاں درد کی راہیں

وہ گنبدِ افلاک کا سر پھوڑ رہے ہیں
دنیا میں کہیں بھی نہ ملیں جن کو پناہیں

جو ہے سو وہی ھاتھ میں تلوار لئے ہے
جب قید تھے الفاظ اب آزاد ہیں باہیں

اب دیکھ لے دُنیا بھی بہائے دل و دیدہ
جب مخزنِ جاں تھے ترے آنسو مری آہیں

تو دور ہو تو میں رگِ جاں میں سمیٹ لوں
تو پاس ہو تو تیری تمنا سوا کروں

کیفیتِ دوام میں گزرے تمام عمر
آنکھیں تو بند ہوں، تری باتیں سنا کروں

سورج کو بڑھ کے شیشۂ مے میں اتار لوں
لو، شام ہو گئی، درِ میخانہ وا کروں

ہے ذات و کائنات کا رشتہ یہی جمیل
بجھ جاؤں دن کے ساتھ تو ہر شب جلا کروں

○

میری وفا کو میری محبت کو بھول کر
دل سے گزر رہا ہے یہ بیگانگی سے کون

وہ جسم کہ بے نور تھا بے برگ و ثمر تھا
چاہت نے اُسے سروِ چراغاں بھی کیا ہے

دنیا ہے تو کیا، وہ تو نہیں گوش بر آواز
جس نے مجھے پُرسوز و غزلخواں بھی کیا ہے

میں نے ہی جسے زندۂ جاوید کیا تھا
اس نے ہی مرے قتل کا ساماں بھی کیا ہے

اب صورتِ حالات پہ حیران ہیں خود بھی
آئینہ گروں نے ہمیں حیراں بھی کیا ہے

بھولے تھے خدا کو، مگر انساں کو نہ بھولے
ہم پر کسی کافر نے یہ احساں بھی کیا ہے

○

ہر مرحلۂ زیست کو آساں بھی کیا ہے
یوں ہم نے علاجِ غمِ دوراں بھی کیا ہے

رندوں پہ تو ہے کفر کا الزام ازل سے
تم نے کسی کافر کو مسلماں بھی کیا ہے

پیمان جو تجھ سے سرِ گلزار کیا تھا
وعدہ وہی الفا پسِ زنداں بھی کیا ہے

سانسوں میں دمِ صبح بسالی تری خوشبو
پلکوں پہ سرِ شام چراغاں بھی کیا ہے

آ دیکھ کہ خونِ کفِ پا، نغمۂ جاں سے
ہم نے تری راہوں کو گلستاں بھی کیا ہے

صبا جب آ کے سلاتی ہے نرم شاخوں کو
ہمیں کچھ اور بھی کرتے ہیں بے قرار درخت

انہیں سے وقت نے سیکھا ہے ارتقا کا چلن
ہوائیں ڈولتے لمحوں کی یادگار درخت

ہے قتلِ عام مگر سر فراز ہیں پھر بھی
اگر وہ ایک بھی کاٹیں اُگیں ھزار درخت

یہ کائنات بھی شاید ہے جنگلوں کا سفر
نظر کے سامنے آتے ہیں بار بار درخت

فلک نے آگ لگائی ، زمیں نے وار کیا
جمیلؔ پھر بھی نہ ہو پائے بے وقار درخت

○

کھڑے ہیں کب سے پس و پیش سایہ دار درخت
چلے چلو کہ ہیں رستوں میں غمگسار درخت

انہی سے دشت و دمن میں نمو کی دھڑکن ہے
ہمارے دیدہ و دل کا ہیں اعتبار درخت

اٹھائے ہاتھ بلاتے ہیں جانے کس کس کو
ہزار صدیوں سے کرتے ہیں انتظار درخت

ہمارے دل میں بھی ہے آتشِ چنار بہت
ہمیں سے ملتے ہیں یارو یہ شعلہ بار درخت

انہی کے سائے میں ہم نے کہی حکایتِ شوق
ازل سے اپنی محبت کے راز دار درخت

ضمیر بھی تو کوئی چیز ہے، ذرا سوچو
کبھی تو گنبدِ احساس کی صدا سن لو

جو ڈوبتی ہوئی کشتی بچا کے لایا ہے
وہی خدا ہے سرِ ساحلِ فنا سن لو

یہ راز، رازِ فنا بھی ہے اور بقا بھی ہے
سمجھ نہ آئے تو آوازِ نقشِ پا سن لو

نہ تم زمین پہ اُترے نہ ہمکلام ہوئے
نقاب اٹھاؤ، مرا شکوۂ رسا سن لو

یہ مہر و ماہ سبھی میری دھڑکنوں کے اسیر
میں اک طلسمِ جہاں ہوں، مری نوا سن لو

جمیلؔ روز طلوع و غروب سے پہلے
دبی زبان میں کہتا ہے کیا، خدا سن لو

○

چاند کی چھت پہ چل رہا ہوں میں
شب کا عنوان بدل رہا ہوں میں

مُنتظِر ہو گی پھر کوئی افتاد
چوٹ کھا کر سنبھل رہا ہوں میں

ساحلوں پر منافقت ہے بہت
موجِ دریا میں پل رہا ہوں میں

روشنی قصر و بام کی زینت
اور چراغوں میں جل رہا ہوں میں

اپنی ہی سوچ کی تمازت سے
لمحہ لمحہ پگھل رہا ہوں میں

مر گئی روح، جسم زندہ ہے
اب کہاں ہوں جو کل رہا ہوں میں

میرا تابوت دفن ہی کر دو
مر کے بھی راز اگل رہا ہوں میں

مرگ و ہستی میں فرق ہے اتنا
جیسے کروٹ بدل رہا ہوں میں

وقت! اب مجھ کو تھام لے بڑھ کر
تجھ سے آگے نکل رہا ہوں میں

اب کھلے گا کہ یہ طلسم ہے کیا
تیرے پیکر میں ڈھل رہا ہوں میں

زندگی یوں گزر رہی ہے جمیل
آگ میں جیسے جل رہا ہوں میں

⊙

تو آئینہ ہے اور مرا دل ہے آئینہ
پھر آج آئینے کے مقابل ہے آئینہ

کچھ اور پاس آ، کہ ہو یہ مرحلہ بھی طے
تیری مری نگاہ میں حائل ہے آئینہ

اُس سے چھپی ہیں کیا مرے چہرے کی سلوٹیں
قاتل سے کیا کہوں، مرا قاتل ہے آئینہ

تو سنگِ آئینہ ہے تو آئینہ گر ہوں میں
یہ جرم ہے تو جرم میں شامل ہے آئینہ

کتنی کدورتوں کا ہے دریا چڑھا ہوا
ہر موج گرد، اور کفِ ساحل ہے آئینہ

چہروں سے جھانکتی ہے شکستوں کی داستاں
آ تو بھی دیکھ، حیرتِ محفل ہے آئینہ

میرے بغیر حسرتِ تکمیل رہ گئی
یوں تو خود اپنی ذات میں کامل ہے آئینہ

تجھ سے تو تیرا عالمِ امکاں حسین ہے
تو حسن ہے تو حسن کا حاصل ہے آئینہ

چلتے رہیں گے وقت کی رفتار دیکھ کر
ہم رہروانِ شوق کو منزل ہے آئینہ

○

عشق میں رسوا ہونے والا آج انوکھی مشکل میں ہے
چُپ سادھے تو مجرم ٹھہرے، بات کرے تو جان سے جائے

○

خلوص و مہر و محبت کے سلسلے بھی گئے
تو کیا گیا، تری محفل سے دل جلے بھی گئے

تمہارے بعد خزاں سے ہی دل لگائیں گے
تمہارے ساتھ بہاروں کے قافلے بھی گئے

کھلی ہے آنکھ تو ڈھونڈو دلِ سحر میں انہیں
جو لوگ شب کے مسافر تھے وہ چلے بھی گئے

کہاں وہ شوق، ہتھیلی پہ جان رکھتے تھے
کہاں یہ حال کہ دل سے وہ ولولے بھی گئے

گئے ہیں یوں تو سرِ دار بھی مگر اب کے
وہ زد پڑی ہے کہ جینے کے حوصلے بھی گئے

سپاہ تاک میں ایسے ، رقیب ہو جیسے
بیانِ حسن و صداقت کے مرحلے بھی گئے

یہ کیا عدالت و قانون ہے خدا والو
بروں کے ساتھ جہنم میں اب بھلے بھی گئے

بلا سے جان گئی چین تو نصیب ہوا
فراق و وصل کے اب سارے فاصلے بھی گئے

جمیلؔ خون کے دریا میں اس طرح ڈوبے
ہمارے ساتھ ہی دو چار من چلے بھی گئے

○

جن سے ہم کو پیار سوا ہے
اُن سے کتنا ڈر لگتا ہے

○

تمام رات چمکتے رہیں گے ماہ و نجوم
مگر یہ کیا کہ ہمیں رنگ و نور سے محروم
فلک پہ نور کی اک سلسبیل چھوڑ گیا
ستارہ ٹوٹ کے کس شان سے ہوا معدوم
مری حیات کا پرتو مری نگاہ میں ہے
کہاں رقم مرے ہاتھوں پہ ہے مرا مقسوم
کبھی کبھی تو تمنائیں یوں ہمکتی ہیں
مچلتی لہروں پہ جیسے رواں بطوں کا ہجوم
میں نکہتِ گلِ تر کی طرح ہوں آوارہ
تو مثلِ بادِ صبا نرم، جانفزا، معصوم
تمہارے غم سے تو واقف ہے اک جہاں لیکن
یہ میرے سینے میں کیسا ہے دردِ نامعلوم
اڑا کے لے گیا طوفانِ گرد باد ہمیں
نہ اب وہ ہم ہیں نہ باقی تصوّرات کی دھوم

حساب مانگ رہے ہیں جمیل قاتل سے
کٹے کٹے مرے بازو، لہو لہو حلقوم

○

افسونِ رخِ نگار کھویا
خوابوں کا حسیں دیار کھویا
اب تجھ کو منا بھی لیں تو حاصل
کھویا، ترا اعتبار کھویا
تاروں کی چمک بھی کھو گئی ہے
جب سے دل داغدار کھویا
ہنگامے تمام سو گئے ہیں
اک فتنۂ روزگار کھویا
ہم کتنے غریب ہو گئے ہیں
سرمایۂ حسنِ یار کھویا؟
وہ بھی تری یاد ہی میں گزرا
جو عرصۂ انتظار کھویا
مَیں نے تجھے بار بار پایا
تو نے مجھے ایک بار کھویا

کیا کیا نہ پہاڑ سر پہ ٹوٹے
کب ہم نے مگر وقار کھویا
وہ پل بھی سکون کی صدی ہے
جس پل کیلئے قرار کھویا
صدیوں کی مسافتیں ہیں درپیش
اک لمحۂ سازگار کھویا
وہ شخص ہی تھا نشانِ منزل
جس کو سرِ رہگزار کھویا
اب گونج ہے اُس کی ہر چمن میں
جو نغمۂ نوبہار کھویا

جاں دے کے بھی کب جمیل ہم نے
گلزار و خیالِ دار کھویا

○

پہلو سے وہ گل عذار گزرا
یا قافلۂ بہار گزرا

گو شمع بھی تا سحر جلی ہے
پروانہ بھی بار بار گزرا

منظورِ نظر ہے جو سبھی کا
کیوں وہ تجھے ناگوار گزرا

کس قہر کی ماتمی فضا ہے
خورشید بھی سوگوار گزرا

دیکھا تو وہاں تھا ہو کا عالم
مَیں آج بکوئے یار گزرا

پتے ہیں نہ اب پرند کوئی
طوفاں سرِ شاخسار گزرا

پھولوں کے حسیں بدن ہیں چھلنی
کیا کیا نہ بنوکِ خار گزرا

پلٹا ہوں تو راہ میں ہیں تارے
دامن میں لیے غبار گزرا

باغوں میں نہال جھومتے تھے
جب موسمِ گیر و دار گزرا

کُندن کی طرح جمیل ہوں میں
میں آگ سے بار بار گزرا

○

کوبکو، قریہ بہ قریہ داغِ رسوائی مِلا
راہ میں جو بھی مِلا تیرا تمنائی مِلا

بیکراں ہوتے گئے عشق و ہوس کے فاصلے
اُن کو بزمِ غیر، ہم کو سوزِ تنہائی ملا

ایک پیکر میں کئی پیکر مجھے لَو دیتے ہوئے
آئینہ در آئینہ ذوقِ خود آرائی مِلا

آج سو سو بار ہوں گی دل کی باتیں دوستو
آج برسوں بعد ہم کو اذنِ گویائی مِلا،

سنگِ طفلاں اُس کے سر پر پھول بن بن کر گرے
شہر میں ایسا بھی ہم کو ایک سودائی مِلا

برف پگھلی، کوہ و دریا، دشت و صحرا ایک تھے
دائروں کو پھاند کر بھائی سے جب بھائی مِلا

جس کو تاروں اور گلزاروں میں کھویا تھا جمیلؔ
غور سے دیکھا تو دل ہی میں وہ ہرجائی مِلا

○

ٹھنڈی سیاہ رات میں دھڑکن جگا کے دیکھ
شمعیں بجھی ہوئی ہیں تو کیا، دل جلا کے دیکھ

میرے بغیر تیری حقیقت کا کیا جواز
اس پر بھی چاہتا ہے تو مجھ کو مٹا کے دیکھ

میرے ہی نام سے ہے بڑا تیرا نام بھی
تجھ کو یقیں نہ آئے تو مجھ کو بھلا کے دیکھ

خالی اگر ہو جیب، گزرتی ہے دل پہ کیا
جو کچھ ہے تیرے پاس، اُسے بھی لٹا کے دیکھ

میں ایک بار بھی نہ ہٹوں تیری راہ سے
تو لاکھ بار میری وفا آزما کے دیکھ

کھیتوں سے تابہ حدِ نظر پھیلتے افق
کتنے حسیں ہیں گھر سے ذرا دور جا کے دیکھ

کتنے جہاں ہیں تیری اڑانوں کے منتظر
اس خاکِ سرنگوں سے کبھی سر اٹھا کے دیکھ

تجھ کو اگر قبول ہیں یہ سنگدل ببول
پھر خاک و خوں سے کھیل، کوئی گل کِھلا کے دیکھ

کس طرح شہر شہر بھڑکتی ہے دل کی آگ
اپنے لہو کا ہاتھ میں پرچم اٹھا کے دیکھ

کتنی قیامتوں کو ہے روکے ہُوئے جمیلؔ
اپنی گلی کے موڑ پہ، چلمن اٹھا کے دیکھ

○

نادیدہ منزلوں کی طرف دم بدم چلے
سب گرد بن کے بیٹھ گئے ایک ہم چلے
تنہا بھی گو ضرور تھے لیکن بہم چلے
ہم لے کے اپنے ساتھ زمانے کا غم چلے
مانوس آہٹوں کی یہیں سے خبر ملی
انجان راستوں پہ ہمارے قدم چلے
گزرے گا کس طرف سے بہاروں کا کارواں
پتے، شجر بصورتِ طبل و علم چلے
منہ بند خواہشات کا میلہ ہے اب وہاں
خوں کے جہاں چراغ جلے، جام جم چلے
منزل ملی تو ہم سے بھی وہ پیش پیش تھے،
جو راہِ زندگی میں قدم دو قدم چلے
چاہت کے واسطے سے ستم بھی عزیز تھا
لے کر ہم اپنے ساتھ تمہارا بھرم چلے

اب زندگی جمیل نئے مرحلوں میں ہے،
سر کر کے سرزمینِ وجود و عدم چلے

○

کس نے یوں پچھلے پہر خواب بکھیرے میرے
نہ اندھیرے ہی رہے اور نہ سویرے میرے

مر کے بھی خاک سے اٹھتی رہی خوشبوئے دوام
پھول ہر دور میں کھلتے رہے تیرے میرے

تیری زلفوں کی مہک بھی نہ بھٹک جائے کہیں
رسن و دار کے جنگل ہیں گھنیرے میرے

کون انصاف کرے جرم ہو ثابت کیسے
میرے پہلو ہی میں بیٹھے ہیں لٹیرے میرے

گل زمینوں پہ بھی پھولوں کے بناؤں سہرے
آسمانوں پہ بھی لہرائیں پھریرے میرے

اب اندھیروں کی سپہ راہ نہ روکے گی جمیلؔ
بستیاں میری، چمن میرے، سویرے میرے

○

خدا کرے شبِ ہستی میں وہ سویرا ہو
جو تیرے دل کا مرے ذہن کا اُجالا ہو
افق افق کی کماں سے کرن کرن پھوٹے
گھنے بسیط اندھیروں میں نور پیدا ہو
ہزار صدیوں سے بنجر زمیں کا بوجھ ہوں میں
کبھی تو میرا بھی سر آسماں سے اونچا ہو
ہوا تھمے تو اُجڑ جائے محفلِ امکاں
ہوا چلے تو قیامت کا شور پیدا ہو
وہ آفتاب بھی لائیں گے روشنی کے سفیر
جو چمنیوں سے ، ہری کھیتیوں سے ابھرا ہو
سجی جو بزمِ رقیباں تو یہ ہوا محسوس
کہ جیسے تو بھی مرے دشمنوں میں بیٹھا ہو
میں روحِ عصر کو لے کر چلا ہوں یوں جیسے
وُہ میرا مونسِ جاں ساتھ ساتھ چلتا ہو

پرند خواب سے جاگے ، چمن مہک اُٹھے
جمیل صبح ہوئی تو بھی نغمہ پیرا ہو

○

وہ دن کی ڈھال، رات کے سب خواب لے گیا
خورشید لے گیا، مرا مہتاب لے گیا

کچھ لٹ لٹا گیا تھا کہ رہزن تھے رہنما
جو کچھ رہا سہا تھا وہ سیلاب لے گیا

صدیوں کے بعد ہم کو ملا تھا جو راہ میں
اک ہمسفر وہ گوہرِ نایاب لے گیا

مانگی تھی سادگی سو ملی ہے برہنگی
وہ اپنے ساتھ اطلس و کمخواب لے گیا

زہراب بن کے پھیل گیا خونِ رائیگاں
وہ اپنی خلوتوں میں مئے ناب لے گیا

باہر کا چور آن ملا گھر کے چور سے
دل سا حسین، خطۂ شاداب لے گیا

تازہ جہانِ شوق تو آباد ہو گئے
وہ کہنہ بستیوں کو تہہِ آب لے گیا

طوفان آ کے ٹل تو گیا خفتگانِ شہر!
شفاف آئینوں کی تب و تاب لے گیا

حیرت سے تک رہے ہیں یہ کیا حشر ہے بپا
تڑپیں تو کیا، وہ فطرتِ سیماب لے گیا

کس سے کہیں کہ ہم سا غنی، ہم سا دردمند
ہم سے متاعِ جذبۂ بیتاب لے گیا

تو نوح سا اگر ہے تو کشتی کوئی نکال
مڑ کر بھی دیکھ، شہر کو سیلاب لے گیا

ٹوٹے پڑے ہیں صورتِ دیوار و در جمیل
جائیں کہاں وہ صحبتِ احباب لے گیا

○

صحرا و دشت و شہر میں سیلاب آ گیا
پھر امتحانِ جرأتِ پایاب آ گیا

جس کو عبور کر کے یہاں تک ہم آئے ہیں
پھر سامنے وہ قلزمِ خوں ناب آ گیا

ان گدلے پانیوں میں چھپے تھے ہزار سانپ
تریاقِ شوق صورتِ زہراب آ گیا

طوفان بھی زور پر تھا، اندھیرا بھی تھا بہت
مَیں لے کے اپنا جذبۂ شب تاب آ گیا

گہرے سمندروں کا بھی سینہ ہوا ہے چاک
میں مثلِ برق و شعلہ و سیماب آ گیا

ڈوبا جو پانیوں میں تو گہرائی تھی بہت
ابھرا تو ہاتھ گوہرِ نایاب آ گیا

اُبھریں گے پھر یہیں سے مرے شہر میرے گاؤں
ہر چند میرا خواب تہہِ آب آ گیا

پتوار بازوؤں کو بنا لو تو بات ہے
ہر ہر قدم پہ حلقۂ گرداب آ گیا

مل جائے گا بھنور ہیں کنارا بھی دوستو
جیسے ہمارے ہاتھ میں مہتاب آ گیا

تاریکیوں کی یورشِ سیلاب تھم گئی
خورشید کا وہ سیلِ جہانتاب آ گیا

جسموں کی کشتیوں سے بنائے ہیں پُل جمیل
یوں پاس چل کے ساحلِ شاداب آ گیا

O

گزرتی ہے جہاں سے زندگی، بادِ بہاری بھی
انہیں رستوں سے ہو کر جائے گی اپنی سواری بھی

بہت دعویٰ تھا جن کو نوعِ انساں کی محبت کا
نہ اُن سے ہو سکی اب تک ہماری غمگساری بھی

وہی زخمِ وفا سے کھیلتے ہیں اجنبی بن کر
وہ جن کے سامنے بازی یہ جیتی اور ہاری بھی

جو ارمانوں کا عنواں تھی، جو خود تسکین ساماں تھی
ہمارے ساتھ ہی جاتی رہی وہ بیقراری بھی

ہمیں اپنے جمال و تمکنت پر ناز تھا کیا کیا
مگر طرفہ قیامت تھی تمہاری انکساری بھی

رہائی کب کی حاصل ہو چکی ہوتی ستم گر سے
مگر بھیں پاؤں کی زنجیر یہ قدریں ہماری بھی

لہو ہم نے دیا اور وہ شہیدوں میں ہوئے شامل
نہ آئی کام کچھ یارو ہماری جاں نثاری بھی

ہماری خاک پر اب آ گئے ہو پھول برسانے
ابھی سے بھول بیٹھے ہو وہ اپنی سنگباری بھی

ہماری بھی انا تھی، جس نے ہم کو دار پر کھینچا
نہ اب باقی رہے گا وہ غرورِ شہریاری بھی

وہ ساعت آئے گی، ٹوٹے ہوئے دل جوڑ جائے گی
تمہاری دلفگاری بھی، ہماری نغمہ کاری بھی

بھری محفل سے اٹھتے جا رہے ہیں گوہرِ یکتا
جمیلؔ اک روز آ جائے گی آخر اپنی باری بھی

○

خود نگر، تیرے مقابل ڈوبے
ہمسفر برسرِ منزل ڈوبے

تو کھلی آنکھوں سے تکتا ہی رہا
تیری آنکھوں میں کئی دل ڈوبے

اُن سفینوں کا بھی پرساں ہے کوئی!
جو سفینے سرِ ساحل ڈوبے!

گھر کو سیلاب بہا لے جائے
مرے آگے مرا حاصل ڈوبے

مَیں وہ مجرم ہوں کہ مر بھی نہ سکوں
شہر کا شہر ہو جل تھل ڈوبے

رقص کرتے رہے آسیبِ جہاں
بادلوں میں مہِ کامل ڈوبے

یا کوئی پیاس بجھائے سب کی
یا یہ ھنگامۂ محفل ڈوبے

آج تو خونِ شہیداں بولے
اپنے ہی خون میں قاتل ڈوبے

بستیاں ڈوب کے ابھریں گی جمیلؔ
پھر نہ ابھریں گے اگر دل ڈوبے

○

یوں تو دنیا میں کیا نہیں لیکن
کیا کوئی چیز آدمی سی ہے

○

کیا چھو سکے گا ہم کو قضا کا، فنا کا ہاتھ
اب اپنے ہاتھ میں ہے تمہاری وفا کا ہاتھ

وہ کاش جانتا کہ وہی تھا وفا کا ہاتھ
جس نے جھٹک دیا ہے مری التجا کا ہاتھ

عیسیٰ نفس کوئی ہو کہ موسیٰ صفت کوئی
جلوہ نما رہا ہے اُسی خود نما کا ہاتھ

آ آ کے روشنی جو پلٹتی ہے بار بار
شانہ بہ طولِ آخرِ شب میں صبا کا ہاتھ

بڑھ کر خود اپنے ہاتھ میں پرچم اٹھالیا
دیکھا تو دستِ غیر میں تھا رہنما کا ہاتھ

میں گر رہا تھا، اُس نے سہارا دیا مجھے
تھا آشنا کا ہاتھ ہی میرے خدا کا ہاتھ

گم گشتہ منزلوں کا نشاں مل گیا ہمیں
کتنا رسا جمیل تھا اُس نارسا کا ہاتھ

○

نفس نفس میں ہے یارو صدی صدی کا حساب
خدا نے پوچھ لیا آج ہی، کبھی کا حساب

مَیں کس خلوص سے اُن کو دکھاؤں آئینہ
وہ مجھ سے پوچھنے آتے ہیں دوستی کا حساب

وہ جن پہ آپ کو تھا اعتمادِ عشق بہت
وہ دے رہے ہیں رقیبوں کو آپ ہی کا حساب

زباں پہ حرفِ محبت اگر نہیں نہ سہی
تمہارے دل میں تو ہوگا ہمارے جی کا حساب

اُدھر وہ قرض چکانے چلے اندھیروں کا
ادھر وہ پاس بھی رکھتے ہیں روشنی کا حساب

خدا تو دور ہے شائد جواب ہی نہ ملے
اب آدمی ہی سے پوچھیں گے آدمی کا حساب

گنے ہیں یوں تو یہ ذرّے بھی اور تارے بھی
مگر نہ ختم ہوا پھر بھی زندگی کا حساب

لہو میں ڈوب کے ہم سرخرو ہوئے آخر
جنوں سے سیکھ لیا ہم نے آگہی کا حساب

اِن آنسوؤں میں فروزاں ہیں قہقہے کیا کیا
یہی جمیل ہے غم کا، یہی خوشی کا حساب!

○

ایسے بھی ہیں درویش جو شہروں کے مکیں ہیں
وہ بھی ہیں ولی جن کی قبا چاک نہیں ہے

○

تمہارا عکس جھلکتا ہے میری نظروں میں
کھلا ہے پیکرِ سیماب صاف چشموں میں

وہ مَیں ہی تھا جو تری جستجو میں نکلا تھا
وہ تو ہی تھا جسے پایا ہے مَیں نے غزلوں میں

نظر سے تو نے گرایا تو یوں ہوا محسوس
کہ سربلند ہوئے اور اپنی نظروں میں

وہ دشمنی بھی کریں، دوست بھی وہ کہلائیں
تمام عمر گزاری ہے کیسے لوگوں میں

ہمارے فن کے تو قائل ہوئے ہیں دشمن بھی
یہ کیا کہ ہم نہ جچے دوستوں کی نظروں میں

وہ قہقہوں میں تو یہ آنسوؤں میں شامل تھے
یہی تو فرق تھا غیروں میں اور اپنوں میں

شبِ سیاہ میں گمنام مر گئے تو کیا
ہمارا ذکر بھی ہے تابناک قبروں میں

حیاتِ نو کے وہاں خواب دیکھتے ہوں گے
جہاں سے روٹھ کے جو جا چھپے ہیں قبروں میں

وہ روحِ عصر سے نظریں ملا کے بات کریں
جو اہتمام سے آتے ہیں روز خبروں میں

ہمیں خبر ہے کہ تازہ ہوا کا کھیل ہے کیا
وہ اور ہوں گے جو بیٹھے ہیں بند کمروں میں

مَیں جو بھی نام پکاروں تو سامنے آئے
جمیلؔ تو ہی چھپا ہے تمام لفظوں میں

○

راہ کو جو آسان بنا دے وہ منزل کیا منزل ہے
ہر منزل سے آگے یارو اپنے شوق کا حاصل ہے
جس کو درد کا درماں سمجھا وہ بھی درد بھرا دل ہے
اتنے درد پہ بھی یہ دنیا کتنے پیار کے قابل ہے
باہر سے آواز یہ آئے تم ہی مسیحا ہو اپنے
میرے اندر شور بپا ہو، دل ہی اپنا قاتل ہے
کچھ منزل پر جا ستائے، کچھ راہوں میں بیٹھ گئے
کوئی کسی کا بھید نہ جانے اپنی اپنی منزل ہے
ہم کو انساں اور خدا کے فرق پہ کتنی وحشت تھی
دیکھا تو اس دورا ہے پر اپنی ذات ہی حائل ہے
رنگِ محبت، رنگِ ابد ہے پھولوں میں مہکار ہے تو
دائم قائم رونقِ ہستی، تیری میری محفل ہے
طوفانوں سے ڈر جائیں تو ساحل سے طوفاں اٹھ گئے
موجوں کو پتوار بنا لیں تو ہر موج ہی ساحل ہے

مشکل کو آسان سمجھ کر ہم ہر عقدہ کھولیں گے
اپنی فکر جمیل کریں وہ، سہل بھی جن کو مشکل ہے

○

چراغِ راہ نہ دن ہے نہ رات ، کوئی نہیں
مَیں چل رہا ہوں مگر میرے ساتھ کوئی نہیں

میں سُن رہا ہوں زمانے کی داستانِ الم
کسی زباں پہ مگر میری بات کوئی نہیں

درازدستیٔ قاتل روا ہے یوں جیسے
مری زباں کی طرح میرے ہات کوئی نہیں

مَیں سُرخ و سبز و سفید و سیاہ میں ہوں رواں
مرے لہو کی طرح میری ذات کوئی نہیں

ہر اک جہان سے آگے جہانِ دیگر ہے
ہو آسماں کہ زمیں، بے ثبات کوئی نہیں

وہ اور ہوں گے محبت میں ہارنے والے
یہاں تو جیت ہی ہوتی ہے مات کوئی نہیں

مٹا سکا ہے بھلا کوئی تاجدار اِسے
جمیلؔ دل سے بڑا سومنات کوئی نہیں

○

چاند میں ہے روشنی یا مری نظر میں ہے
آج میرے ساتھ ساتھ چاند بھی سفر میں ہے

جس کو ڈھونڈتے ہو تم وہ کہاں خبر میں ہے
اپنے دل میں جھانک لو گھر کی چیز گھر میں ہے

کچھ تو دل کا درد بھی اپنے کام آ گیا
اور کچھ خلوص بھی چشمِ چارہ گر میں ہے

اپنا فن بھی ہے یہی اپنا دھن بھی ہے یہی
زخم سا جو دِل میں ہے شور سا جو سر میں ہے

رقص ہے یہ موت کا یا نئی حیات کا
تیری میری زندگی آج کس بھنور میں ہے

کیا تھیں وہ قیامتیں پل میں جو گزر گئیں
آگ خشک و تر میں ہے خون بحر و بر میں ہے

پستوں سے دودھ کی ندیاں نہ کیوں بہیں
تیشۂ خود آگہی دستِ کارگر میں ہے

قافلوں سے قافلے پھر جمیل آ ملے
رقصِ شوق و سرخوشی پھر نگر نگر میں ہے

○

جمیلؔ دل میں وہ شوقِ فضول بیٹھا تھا
پھر اس گلی میں ہوں میں جس کو بھول بیٹھا تھا

اڑا کے لے گئی آندھی کہاں کہاں اس کو
میں لے کے اپنی محبت کا پھول بیٹھا تھا

اُسی کی خاک سے آتی ہے بوئے دلداری
گلی گلی کی اُڑا کر جو دھول بیٹھا تھا

کسے خبر تھی اٹھا لے چلے گی بادِ بہار
خزاں کی راہ میں کتنا ملول بیٹھا تھا

شبِ وصال کو روکا ہے کس قرینے سے
ہر ایک بات کو میں دے کے طول بیٹھا تھا

خدا بھی یاد نہ تھا مجھ کو اور ان بھی
ہوا تھا یوں کہ ذرا خود کو بھول بیٹھا تھا

وہاں وہاں سے ہوا حسنِ آگہی رخصت
جہاں جہاں بھی کوئی بے اصول بیٹھا تھا

جمیلؔ دل بھی عجب ناسمجھ پرندہ ہے
کبھی جو پیار کی ٹہنی پہ جھول بیٹھا تھا

○

تیری زباں پہ صرف تری واردات ہے
میرے لبوں پہ سارے زمانے کی بات ہے

یہ ذات ہی وسیلۂ صد ممکنات ہے
تکمیلِ کائنات ہی تکمیلِ ذات ہے

تاروں کی مشعلیں ہیں پس و پیش، ضو فگن
ٹھہری ہوئی یہ چاند میں کس کی برات ہے

اک پل رُکے، تو ٹوٹ پڑے گی سیاہِ شب
آگے نکل گئے، تو اندھیروں کو مات ہے

ممکن نہیں کہ ہم کو جدا کر سکے کوئی
اے دوست میرے ہاتھ میں اب تیرا ہاتھ ہے

کس کو مِلی ہے عشق و ریاضت کی انتہا
شائد رہِ تلاش ہی راہِ نجات ہے

آتے ہیں کس طرف سے بہاروں کے قافلے
یہ زندگی جمیل اگر بے ثبات ہے

○

گھر میں مٹی کا دیا روشن ہے
تو نہیں، تیری وفا روشن ہے

کوئی جگنو ہے کہ تارا ہے کہ دل
گھور اندھیرے میں یہ کیا روشن ہے

میری خوشبو سے معطر ہیں دماغ
تیری ایک ایک ادا روشن ہے

اس طرح جھوم کے آئی ہے بہار
شعلۂ گل سے فضا روشن ہے

خونِ دل رنگ تو لایا آخر
تیرے ہاتھوں کی حنا روشن ہے

[illegible] فروزاں تو ہوا
شبنم و گل کی قبا روشن ہے

یہ لے کرنوں کی سواری نکلی
کو بکو بادِ صبا روشن ہے

جل بجھی شمع بھی، پروانے بھی
ایک احساسِ ایثار روشن ہے

تم اسے چاند کہو یا سورج
اپنا نقشِ کفِ پا روشن ہے

ہے اندھیرے میں اجالے کا سماں
چار سو تیری نوا روشن ہے

دل وہ فانوسِ تجلی ہے جمیل
جس میں ہر وقت خدا روشن ہے

○

کھل کھل کے تابہ شام، بکھرتی ہے زندگی
کن کن قیامتوں سے گزرتی ہے زندگی

انجان ساحلوں پہ اترتی ہے زندگی
زندہ دلی کی کھوج میں مرتی ہے زندگی

کتنی حقیقتوں کو بناتی ہے جاں نواز
جب خواب بن کے ابھرتی ہے زندگی

آ آ کے جلوتوں میں لٹاتی ہے جانِ و دل
جا جا کے خلوتوں میں سنورتی ہے زندگی

لاتی ہے موت کی بھی خبر وہ صدف کے ساتھ
جب گہرے پانیوں میں اُترتی ہے زندگی

سیلابِ زمانہ بن کے بجھاتے ہیں تشنگی ،
پاؤں اگر زمین پہ دھرتی ہے زندگی

کن پستیوں میں آ کے ڈبوتی ہے کشتیاں
کتنی بلندیوں سے اترتی ہے زندگی

تم ہی کہو ، وہ کون سی حد ہے زوال کی
جب زندگی کے نام سے ڈرتی ہے زندگی

عرفانِ کائنات کا یہ بھی ہے سلسلہ
گمنام راستوں سے گزرتی ہے زندگی

وہ سب صداقتیں ہیں اسی زندگی کے پاس
جن جن صداقتوں سے نکھرتی ہے زندگی

ہوتی ہے کتنے کرب سے تخلیقِ نو جمیل
ہر بار کس وقار سے مرتی ہے زندگی

○

بجا سہی کہ میں کافر ہوں میرا دیں بھی نہیں
کسی کے خون سے تر میری آستیں بھی نہیں

جو دیکھنا ہو تو محرابِ جاں میں آؤ ذرا
نہ یہ کہو کہ منور مری جبیں بھی نہیں

سمجھ سکو تو یہ مٹی ہی میرا سونا ہے
سوائے شوق کوئی چیز بہتریں بھی نہیں

جس انقلاب کو آنا ہے وہ تو آئے گا
یہ بات چھوڑ مجھے یا تجھے یقیں بھی نہیں

وہ جن کے ساتھ گزاری ہے زندگی میں نے
انہیں میں آج مرا ذکرِ دلنشیں بھی نہیں

میں کس امید پہ تجدیدِ دوستی کرلوں
ترے لبوں پہ تو دھیمی سی وہ "نہیں" بھی نہیں

یہ کیا کہ پھر بھی ٹپکتا ہے قطرہ قطرہ لہو
کئی دنوں سے وہ قاتل مرے قریں بھی نہیں

امڈ کے آئے ہیں سیلاب اس طرح اب کے
فلک بھی دور ہے پاؤں تلے زمیں بھی نہیں

ہے میرا نام فروزاں ابد کے سینے میں
وہ اس خیال سے خوش ہیں کہ میں کہیں بھی نہیں

مرے جمال سے قائم جلال ہے تیرا
ترے جلال سے بڑھ کر کوئی حسیں بھی نہیں

میں کیوں نہ ہدیۂ شیریں کلام پیش کروں
جمیلؔ پاس کوئی اور انگبیں بھی نہیں

○

اِس دشتِ نارسا میں کوئی دوسرا تو ہو
دشمن ہی گھات میں ہو مگر سامنا تو ہو

یوں تو خلوصِ دل ہے متاعِ ہُنروراں
لیکن خلوصِ دل کو کوئی پوچھتا تو ہو

آندھی اڑا کے لے گئی سارے نقوشِ پا
منزل کی سمت جائیں مگر راستا تو ہو

تصویر کیا بنائیں، گریزاں ہیں نقش و رنگ
میرے لہو میں تیرا لہو بولتا تو ہو

کس کو نہیں قبول ترا دردِ لا دوا
لیکن تری ادا کی طرح دلربا تو ہو

گو تیرے بعد عام ہوئی چشمِ التفات
چاہوں اُسے جو میری طرح سوچتا تو ہو

جو مُجھ کو پا سکے، جسے اپنا بنا سکوں
زود آشنا بہت، کوئی دیر آشنا تو ہو

جو سب کے ساتھ ساتھ رہے اور جدا لگے
اس شہرِ ناسپاس میں وہ رہنما تو ہو

گہرے سمندروں سے بھی موتی اچھال دے
وہ ناخدا بھی آئے وہ سیلِ بلا تو ہو

یہ کیا کہ دو قدم پہ مِلے منزلِ وصال
مَیں شوقِ لازوال ہوں، تو نارسا تو ہو

محرابِ جاں میں دل کا جلا کر دیا جمیلؔ
میری طرح خدا کو کوئی پوجتا تو ہو

○

مستقل زخمِ وفا بن جاؤں
میں فنا ہو کے بقا بن جاؤں
تو خدا سے اگر انسان بنے
میں بھی بندے سے خدا بن جاؤں
تیری پہچان کی صورت ہے یہی
میں بھی تیری ہی ادا بن جاؤں
رنگ و خوشبو سے تجھے مہکاؤں
عنبر و عود و صبا بن جاؤں
میرا خوں کیوں ترے دامن پہ رہے
تیرے ہاتھوں کی حنا بن جاؤں
یونہی کچھ زخم چھپاؤں اپنے
تیری گلگونہ قبا بن جاؤں
مختصر طولِ شبِ ہجر کروں
حلقۂ زلفِ رسا بن جاؤں

کسی نغمے سے بھی تسکیں نہ ملی
دلِ مفلس کی نوا بن جاؤں

دل کی آواز فقط دل نے سنی
تشنہ لب کی صدا بن جاؤں

مہ و خورشید بھی طلعت مانگیں
مَیں وہ نقشِ کفِ پا بن جاؤں

میری مٹی سے ہو تعمیرِ جہاں
آتش و آب و ہوا بن جاؤں

عمر بھر راہبروں نے لوٹا
آج خود راہنما بن جاؤں

جس سے ہر گھر میں اجالا ہو جمیلؔ
میں وہ مٹی کا دیا بن جاؤں

○

آنگنوں میں گھپ اندھیرا ممٹیوں پر دھوپ
ایک سنہرا رنگ ہے اور ایک تیرا روپ

○

مَیں آرہا ہوں، مرے گھر میں جل رہے ہیں چراغ
وہ روشنی ہے کہ سورج میں ڈھل رہے ہیں چراغ

وہ شب چراغ ہوں راہوں میں روشنی ہے بہت
میں یوں رواں ہوں، مرے ساتھ چل رہے ہیں چراغ

وہ دن گئے کہ بجھاتی تھیں آندھیاں اِن کو
اب آندھیوں کا بھی منظر بدل رہے ہیں چراغ

ہمہ ایک ذرّۂ خاکی ہے آئینہ خانہ
ہر ایک کُنجِ چمن سے نِکل رہے ہیں چراغ

وُہ چپ لگی تھی کہ برسوں دھواں نگلتے رہے
زباں ملی ہے تو لاوا اُگل رہے ہیں چراغ

جو سر کٹے تھے زمیں کو بھی کر گئے سیراب
لویں بلند ہیں گر گر سنبھل رہے ہیں چراغ

وہ پھول پھول پہ شبنم، کلی کلی کی پکار
بجھے دلوں میں سلگتے کنول رہے ہیں چراغ

وہ جن کو روزنِ زنداں سے بھیجتے تھے کرن
وہ ماہ و انجم و گل میں مچل رہے ہیں چراغ

وہی چراغ ہوتے ہیں بطرز نو روشن
ہر ایک دور میں جو بے بدل رہے ہیں چراغ

میں کیوں نہ چوم لوں تجھ کو ہوائے آئندہ
وہ آج نورِ سحر ہیں، جو کل رہے ہیں چراغ

وہ فاختہ جو افق تا افق ہے بال فشاں
جمیل اُسی کی اڑانوں میں پل رہے ہیں چراغ

○

اُس نے پایا کھِلے گلابوں کو
جس نے چوما مری کتابوں کو
اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر دیکھو
بھول جاؤ گے سب سرابوں کو
ہو نظر تو حجاب بھی جلوہ
کیا خبر ہے یہ بے حجابوں کو
جن کے گھر میں چراغ تک بھی نہیں
کیا کریں گے وہ آفتابوں کو
ہے وہی تیرگی دماغوں کی
روز بدلا کرو نصابوں کو
جو زمیں روز خوں اگلتی ہے
وہ جنم دے گی انقلابوں کو
یوں تو ناداں چکور تھے لیکن
جا لیا ھم نے ماہتابوں کو

یہ تو جوگی ہیں پانیوں کے جمیل
چھیڑ نے کیا ہوا ان حبابوں کو

○

نشاں زمیں کے مرے آسماں سے ملتے ہیں
کہاں کہاں کے گلستاں یہاں سے ملتے ہیں

میں خود قفس میں ہوں لیکن نئی بہار کے پھول
مرے چمن سے مرے آشیاں سے ملتے ہیں

میں سنگِ میل بھی ہوں اور چراغ منزل بھی
سبھی سراغ مری داستاں سے ملتے ہیں

تو کیوں نہ مل کے کریں آپ ہی مسیحائی
ہمارے غم بھی، غمِ دوستاں سے ملتے ہیں

چلا ہے جانبِ منزل جو قافلہ دل کا
لپک کے ہم بھی اُسی کارواں سے ملتے ہیں

عجب نہیں کہ وہ خود بحرِ بیکراں بن جائیں
سفینے آج یمِ بیکراں سے ملتے ہیں

حریم جاں میں سجا لو کہ روشنی ہو مدام
ہم ایسے گوہرِ یکتا کہاں سے ملتے ہیں

کریں تلاش تو آبِ حیات کے چشمے
جمیلؔ آج بھی ریگِ رواں سے ملتے ہیں

○

ہو گیا ہے کیا سے کیا وہ ماہ پیکر، دیکھ لے
جو نہیں دیکھا ہے تو نے آج آ کر، دیکھ لے

رنگ و بو بھی نام میرا، خاک و خوں بھی میرا نام
وہ بھی نظارہ تھا میرا، یہ بھی منظر دیکھ لے

جو کبھی کرتے تھے گل کی پتیاں مجھ پر نثار
آ ذرا، اور آج ان ہاتھوں میں پتھر دیکھ لے

میں کسی کا خوں پیوں گا، مجھ کو یہ طعنہ نہ دے
اپنے ہی خوں سے بھرا ہے میرا ساغر دیکھ لے

کس طرح سیلاب بڑھ کر کھینچ لیتے ہیں زمیں
کس طرح ہوتے ہیں بستے لوگ بے گھر، دیکھ لے

تو مرا قاتل سہی، لیکن بچے گا تو کہاں
جو کھُلا ہے وقت کے ہاتھوں میں خنجر دیکھ لے

میرا سایا تو نہیں ہے، تیرا سایا ہی نہ ہو
آج تجھ سا کون ہے میرے برابر، دیکھ لے

ہاتھ خالی ہیں تو کیا ہے پاؤں زخمی ہیں تو کیا
سایۂ بالِ ہما ہے میرے سر پر، دیکھ لے

ہے افق سے تا افق تیری اڑانوں کا سفر
بازوؤں کو کام میں لا، اپنے شہپر دیکھ لے

کل جسے دفنا دیا تھا ہم نے اپنے ہاتھ سے
آج پھر زندہ ہوا وہ ماہِ خاور، دیکھ لے

ڈوب کر جو کر گیا تجھ کو جمیل اتنا اداس
پھر ابھر آیا وہ سورج، چل یہ منظر دیکھ لے

○

گھر سے باہر تیرگی ہے اور اندر روشنی
پاؤں ہیں اندھے کنوئیں میں اور سر پر روشنی

اُن کی نظروں میں فقط قد کے برابر روشنی
اپنی آنکھوں میں ہے جلووں کا سمندر روشنی

ہم سے پروانے بھی اِس کے ہاتھ سے مصلوب ہیں
کتنی قاتل روشنی، کتنی ستم گر روشنی

یہ اندھیروں اور اجالوں کی پرانی دھوپ چھاؤں!
لیکن اب کے لائی ہے کچھ اور منظر روشنی!

لاکھ اب دشمن کریں تاریکیوں سے سازباز
ہو چکی ہے دوستو اپنا مقدر روشنی

تاجداروں کے لئے زنجیر اس کی ہر کرن
جو برہنہ سر ہیں اُن کے سر پہ چادر روشنی

جسم پر لہرائے تو ڈھل جائے صدیوں کا غبار
روح میں گھل جائے تو ہے عود و عنبر روشنی

اک نئی دنیا جنم لے گی ہمارے خون سے
میرا پیکر رنگ و خوشبو، تیرا پیکر روشنی

وہ اندھیروں سے، خزاں سے مات کھا سکتے نہیں
جن کی منزل موسمِ گل، جن کا محور روشنی

اپنے سینے میں لئے پھرتا ہوں میں غارِ حرا
میرا ایماں روشنی، میرا پیمبر روشنی

اپنے فن کی آگ سے سر و چراغاں ہوں جمیلؔ
میں سراپا شاعری میری سخنور روشنی

○

جمال تیرا ہی میرا فن ہے
کِھلا ہوا پیار کا چمن ہے
ہر ایک گُل کی ہے اپنی خوشبو
کلی کلی پردۂ سخن ہے
کِھلی کِھلی ہے لہو کی رنگت
کہ یہ بہاروں کا بانکپن ہے!
بہت اجالوں کے تذکرے ہیں
مگر گریزاں کرن کرن ہے
کہاں سے چل کر کہاں تک آئی
ہوا بھی بے گھر ہے، بے وطن ہے
اب اپنی ہستی کے گِرد و پیش ہوں
نہ راہبر ہے نہ راہزن ہے
عجب ولایت ہے دل بھی، جس میں
نہ شہر کوئی نہ کوئی بن ہے

پہاڑ تیشے بغیر کاٹے
یہ دل بھی کیا خوب کوہکن ہے
یہ کہہ رہا ہے ہر اک بُنِ مُو
یہ جسم ہی میرا پیرہن ہے
جو پیرہن آبروئے تن تھا
کُھلا کہ آخر وہی کفن ہے
میں سیم و زر لے کے کیا کروں گا
یہ اپنی مٹی ہی میرا دھن ہے
ترے سہارے ہی جی رہا ہوں
نہ روح اپنی نہ اپنا تن ہے
سمندروں میں کہاں ملے گی
جو لہر سینے میں موجزن ہے
ہزار باتیں، مگر ادھوری
ازل سے یہ عشق کا چلن ہے

جمیلؔ خورشیدِ جاں ہے تاباں
اسی سے روشن چراغِ فن ہے

میں سنگِ میل بھی ہوں اور چراغِ منزل بھی

○